معرکۂ حق (بُنیانٌ مرصوص)

اِدارۂ فروغِ قومی زبان
قومی ورثہ وثقافت ڈویژن، حکومت پاکستان

ماہنامہ

اخبارِ اُردو

اسلام آباد

مئی، جون ۲۰۲۵ء

ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد میں یوم تشکر کے موقع پر ڈائریکٹر جنرل ادارۂ فروغ قومی زبان پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ایگزیکٹو ڈائریکٹر ڈاکٹر راشد حمید، محبوب خان بگٹی، انور سرور، ڈاکٹر عارف حسین و دیگر

پاکستانی مسلح افواج، حکومت اور عوام نے یکجان ہو کر بہادری اور غیرت مندی سے دشمن کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر

اسلام آباد۔ ادارۂ فروغ قومی زبان میں دشمن کے خلاف پاکستان کی شاندار فتح پر یوم تشکر منایا گیا۔ اس موقع پر سامعین سے خطاب کرتے ہوئے ادارے کے ڈائریکٹر جنرل، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے کہا کہ ہماری حکومت اور مسلح افواج قابل تحسین ہیں انھوں نے بے مثال بہادری اور جرأت سے دشمن کا مقابلہ کر کے اسے شکست فاش دی۔ آج ہم یوم تشکر مناتے ہوئے رب سے امن و سلامتی اور پاکستان کی ترقی کی دعا کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس موقع پر عوام بھی مسلح افواج کے شانہ بشانہ موجود تھی۔ افواج پاکستان کی جنگی کامیابی میں اُن کی محنت اور جوش کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی دعائیں بھی شامل تھیں۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل عاصم منیر نے اپنی تقریر میں بجا فرمایا کہ دنیا بھر میں ریاست مدینہ اور پاکستان دو ایسے ممالک ہیں جو نظریات کی بنا پر بنے اور اللہ ان کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے گا۔ ڈاکٹر راشد حمید، ایگزیکٹو ڈائریکٹر ادارۂ فروغ قومی زبان، نے کہا کہ آج ملک بھر میں عوامی سطح پر یوم تشکر منایا گیا جہاں نماز جمعہ کے بعد مساجد میں ملکی سلامتی کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ دیگر مقررین نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پہلگام واقعے پر پاکستان کے سچائی پر مبنی مؤقف کا دنیا بھر نے ساتھ دیا۔ پاکستان نے ہر محاذ پر پاکستان میں اور بیرون ملک بھرپور کوشش سے اپنا سچا مؤقف منوایا اور ماضی کی طرح دنیا کو بھارت کے جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد، پاکستانی لیڈر شپ، مسلح افواج اور عوام کی بہادرانہ کوشش سے پاکستان اقوام عالم میں سرخرو ہوا ہے۔

ڈائریکٹر جنرل، ادارۂ فروغ قومی زبان پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ گلناز محمود

کراچی۔ یوم تشکر کے موقع پر اردو لغت بورڈ میں بزم اساتذہ اردو، اور اردو سندھی ادبی سنگت کے تعاون سے تقریب کا انعقاد ہوا۔ اسی تسلسل میں بزم اساتذہ اردو (رجسٹرڈ) سندھ بہ اشتراک اردو سندھی ادبی سنگت نے اردو لغت بورڈ کراچی میں یوم تشکر کے موقع پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری یادگاری ہال میں ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر شکیل احمد خان کے افسانوی مجموعے ''کیکٹس'' کی رونمائی ہوئی۔ تقریب کی صدارت مریٹوریس پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال نے کی جبکہ مہمان خصوصی سید زیب اذکار حسین تھے۔ تقریب کے آغاز میں پروفیسر سعید حسن قادری نے تلاوت قرآن پاک کی سعادت حاصل کی۔ پروفیسر ملک عبد القدیر غوری نے یوم تشکر کی مناسبت سے اپنی گفتگو میں کہا اساتذہ اور قلم کار نظریاتی سرحدوں کے محافظ ہیں۔ ڈاکٹر ظفر اقبال نے یوم تشکر کی اہمیت اجاگر کرنے کے بعد افسانوی مجموعے ''کیکٹس'' پر گفتگو کی۔ مہمان خصوصی سید زیب اذکار حسین نے افسانوی ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر شکیل احمد خاں کے مجموعے کیکٹس کو معاشرتی تشبیب و فراز کی نمائندگی قرار دیا۔ پروفیسر سعید حسن قادری، پروفیسر شاہد کمال، ڈاکٹر فرحت عظیم، پروفیسر نعیم خالد، پروفیسر صفدر علی خان انشاء نے افسانہ نگار کے فن و شخصیت کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالی۔ چیئر پرسن اردو سندھی ادبی سنگت گلناز محمود نے کہا ہم ادب کے فروغ لیے ہر سطح پر سرگرم عمل ہیں۔ گلناز محمود نے کلمات تشکر پیش کرتے ہوئے ڈائریکٹر جنرل، ادارۂ فروغ قومی زبان پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا کہ ان کی زیر سرپرستی اس وقت ملک کے تین اہم علمی و ادبی ادارے ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، اردو سائنس بورڈ لاہور اور اردو لغت بورڈ کراچی میں فعال ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل ادارہ فروغ قومی زبان کا خصوصی پیغام حاضرین کو سنایا۔ ''بنیان مرصوص'' کا لفظ اردو لغت میں درج ہے اور نظر ثانی میں موجودہ فتح کے تناظر میں نئے معنی کا اندراج بھی کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد کے فیلڈ دفتر اردو لغت بورڈ کراچی میں یوم تشکر کے موقع پر گلناز محمود، ڈاکٹر شکیل احمد خان، مریٹوریس پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال، سید زیب اذکار حسین و دیگر

ماہنامہ

اخبارِ اُردو

اسلام آباد

جلد: ۴۳ شمارہ: ۵، ۶...... مئی، جون ۲۰۲۵ء

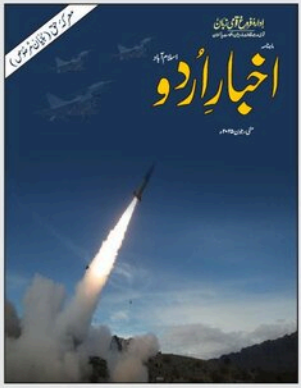

سرپرست: پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ڈائریکٹر جنرل
مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر راشد حمید
مدیر: ریحانہ گل نایابؔ
کمپوزنگ: فخر زمان خٹک، عبدالرازق آفریدی
پروف ریڈنگ: نور محمد خاور
گرافک ڈیزائنر: محمد رضوان عزیز کیانی

برائے رابطہ: +۹۲ ۵۱ ۹۲۶۹۷۵۲، +۹۲ ۵۱ ۹۲۶۹۷۵۷
برقی ڈاک: akhbareurdu@gmail.com
ویب سائٹ: www.nlpd.gov.pk
پتا: ادارہ فروغِ قومی زبان (سابقہ مقتدرہ قومی زبان)
قومی ورثہ وثقافت ڈویژن، حکومت پاکستان
پطرس بخاری روڈ، ایچ ۴/۸، اسلام آباد، پاکستان

قیمتِ خریداری

سالانہ: ۳۰۰ روپے فی پرچہ: ۳۰ روپے
بیرون ممالک: ۲۵ امریکی ڈالر
بذریعہ منی آرڈر بنام اخبار اردو یا نقد دفتر ہذا میں جمع کرانے ہیں

ناشر: ایگزیکٹو ڈائریکٹر، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد

مندرجات

○	اداریہ	ڈاکٹر راشد حمید	۲
۱	اُردو تنقید کا مختصر پس منظر و اجمالی جائزہ	معظمہ نقوی	۳
۲	ترجمے کے اصول	سید باقر حسین	۷
۳	علامہ اقبال اور تعلیم و تربیت کا مثالی نظام	ڈاکٹر عارف حسین	۱۰
	خبرنامہ		۱۴
۴	اُردو املا کے نظری اصول و مباحث کی تاریخی روایت	ڈاکٹر ابرار خٹک	۱۸
۵	ضلع بھکر: علمی و ادبی چراغوں کی سرزمین	رمشا ملک	۲۵
۶	شعیب صدیقی کی اُردو شاعری	فیصل شہزاد تونگر	۲۷
۷	خطبات بابائے اردو مولوی عبدالحق	سیّد روح الامین	۲۸
	کتاب میلہ		۲۹

☆☆☆☆

طابع: اُردو ڈکشنری بورڈ پریس، کراچی (ذیلی دفتر) ادارہ فروغ قومی زبان، قومی ورثہ وثقافت ڈویژن

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

یومِ تشکر — اتحاد، ایثار اور دفاعِ وطن کی نئی تعبیر

گزشتہ چند ہفتوں میں پاکستان اور بھارت کے درمیان پیدا ہونے والی غیر معمولی کشیدگی نے نہ صرف خطے کی فضا کو تشویش ناک بنایا بلکہ ایک بار پھر ہمیں اپنی سرزمین کی حفاظت، قومی وحدت اور عسکری تیاری پر ازسرِ نو غور کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ایسے نازک حالات میں جب دشمن کی نظریں ہماری جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں پر تھیں، پاکستان کی بہادر افواج، مضبوط سیاسی قیادت اور متحد عوام نے دشمن کو ایک بھرپور پیغام دیا: ہم ایک ہیں، جاگ رہے ہیں اور ہر قیمت پر مادرِ وطن کا دفاع کریں گے۔

یہ حالات محض ایک جنگی صورتِ حال نہ تھے بلکہ ایک آزمائش تھی جس میں پاکستان نے صبر، حکمت اور مستعدی سے کام لیا۔ فوجی محاذ سے لے کر سفارتی محاذ تک، ہر سطح پر ہماری کارکردگی مثالی رہی۔ یہ دن ہمیں اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ ملکی سالمیت صرف ہتھیاروں سے نہیں بلکہ قوم کے جذبے، اتحاد اور قربانی سے قائم رہتی ہے۔

اسی پس منظر میں ہم یومِ تشکر مناتے ہیں — یہ شکرانے کا دن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک باشعور قوم، باوقار افواج اور متحد قیادت عطا کی۔ یہ دن ان شہیدوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا دن ہے جنھوں نے وطن کی خاطر جان نچھاور کی، اور ان سپاہیوں کی ہمت کو سلام کرنے کا دن ہے جو سرحدوں پر بے خوف کھڑے رہے۔

اسی قومی فخر، جذبۂ ایثار اور عزمِ نو کے تحت ہمیں یقین ہے کہ موجودہ نسل اس تجربے سے سبق سیکھے گی اور آنے والے دنوں میں مزید مضبوط، باشعور اور وطن سے وفادار ہوگی۔

ہمیں یومِ تشکر کو صرف تقاریر اور تقاریب تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ اسے قومی وحدت، باہمی محبت اور عملی اقدامات کا آغاز بنائیں۔ کیونکہ یہی ہماری بقا کی ضمانت ہے۔

ڈاکٹر راشد حمید

معظمہ نقوی، ڈیرہ غازی خان

اُردو تنقید کا مختصر پس منظر و اجمالی جائزہ

کسی بھی فن پارے کو اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر علمی و فنی نقطۂ نظر سے اس کا موازنہ کرنا، جانچنا تنقید کہلاتا ہے، تنقید انگریزی میں Criticism عربی قواعد کی رُو سے صحیح لفظ نقد یا انتقاد ہے۔ فارسی میں تنقید کی اصطلاح رائج نہیں رہی۔ اس میں لفظ انتقاد دیکھنے میں آیا ہے لیکن بہت کم! جبکہ اردو میں لفظ تنقید رائج ہوا ہے۔ تاہم نیاز فتح پوری اور عابد علی عابد دو ایسے ناقدین ہیں جنھوں نے تنقید کے برعکس انتقاد استعمال کیا۔ تنقید لفظ کے متبادل کے طور پر آل احمد سرور نے پرکھ کا لفظ تجویز کیا ہے۔ یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ تنقید ادب اور ادبی تخلیقات کی تفہیم و تشریح کے لیے وقف ہے مگر خود تنقید کی تفہیم و تشریح پر محققین اور ماہرین کا اتفاق رائے نہیں ملتا۔ پیشتر تخلیق کاروں کے ذہن میں نقاد اس جابر سکول ماسٹر کے مترادف ہے جو کسی کو شاباش نہیں دیتا ہے ایک دو استثنائی مثالوں سے قطع نظر اردو ناقدین کی اکثریت ادبی آمر کی نہیں ہے بلکہ اکثریت ان ناقدین کی ہے جو ہمدردانہ طور پر تخلیقات کا مطالعہ کرتے اور نیک نیتی سے ادب پارہ کے حسن و قبح کو اجاگر کرتے ہیں۔ انگریزی اور اردو کے چند بڑے ناقدین کے اسما ایسے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ نقادوں کی اکثریت تخلیق کار کی بھی ہے۔ ان میں ڈرائیڈن، میتھیو آرنلڈ، کولرج، ورڈزورتھ، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ جبکہ فرانس میں ژاں پال سارتر اور اردو میں میر تقی میر، میر حسن، مصحفی، شیفتہ (یہ چاروں تذکرہ نگار ہیں) الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، نیاز فتح پوری، فراق گورکھ پوری، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، سجاد باقر رضوی۔ یہ محض چند نام ہی نہیں بلکہ اردو تنقید میں فکر و نظر کے تنوع کے ضامن ہیں جبکہ معاصرین میں سے ڈاکٹر وزیر آغا، انیس ناگی، ساقی فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی، علی سردار جعفری، جیلانی کامران وغیرہ جیسے بڑے بڑے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ اب ہم تنقید کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اردو ادب کی تنقید کی جانب بڑھیں گے چونکہ اردو لشکری زبان ہے۔ اس لیے اس کے ادب و ثقافت میں بھی عربی و فارسی اور مغربی ادب کے بھرپور اثرات موجود ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے ان زبانوں کے ادب پر نظر ثانی چیدہ چیدہ الفاظ میں کر لیں۔

> اردو میں میر تقی میر، میر حسن اور مصحفی تذکرہ نگار ہیں۔ الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، نیاز فتح پوری، فراق گورکھ پوری، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور سجاد باقر رضوی محض چند نام ہی نہیں بلکہ اردو تنقید میں فکر و نظر کے تنوع کے ضامن ہیں

عربی تنقید کے بارے میں بات کرنے سے پہلے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ عربی مسلمانوں کی دینی زبان تو ہے ہی لیکن ایک عرصے تک سرکاری زبان بھی رہی ہے۔ برصغیر میں عہد غزنوی میں سرکاری زبان عربی تھی۔ اس کے علاوہ عربی ادبی زبان بھی رہی ہے۔ کئی ایسے ممالک ہیں جن کی زبان عربی تھی۔ اس کے علاوہ عربی ادبی زبان میں ادب تخلیق ہوا۔ ایران اور برصغیر اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ایران میں فارسی شاعری کا آغاز عربی شاعری کے زیر اثر ہوا۔ فارسی نثر بھی ایک عرصے تک عربی کے اثر سے آزاد نہ ہو سکی۔ فارسی تنقید کی عمارت عربی کے تنقیدی اصولوں پر استوار ہوئی۔ اردو شاعری کا ارتقاء فارسی شاعری کے زیر سایہ ہوا اور اردو کی کلاسیکی شاعری تو فارسی سے اس حد تک متاثر ہے کہ اسے فارسی شاعری کی پرچھائیں قرار دیا گیا ہے۔ اردو تنقید کے پیمانے بھی فارسی سے مستعار لیے گئے ہیں گویا عربی تنقید کے اثرات فارسی کے ذریعے اردو تنقید تک پہنچے، اس لیے ان تنقیدی افکار کا سرچشمہ عربی ہے۔ مورخین ادب نے عربی ادب کے مندرجہ ذیل ادوار مقرر کیے ہیں:

ا۔ دورِ جاہلیت	۴۷۵ء ---- ۶۲۲ء
ا۔ دورِ خلفائے راشدین و اموی	۶۲۲ء ---- ۷۵۰ء
ا۔ دورِ عباسی	۷۵۰ء ---- ۱۲۵۸ء
ا۔ دورِ ترکان	۱۲۵۵ء ---- ۱۷۹۸ء
ا۔ جدید دور	۱۷۹۸ء سے اب تک

تنقید ہمیشہ ادب کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی ہے، چنانچہ عربی تنقید بھی ان ہی ادوار کے ساتھ ساتھ چلی ہے۔ غزنوی دور میں فارسی تنقید کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ علم بدیع میں فارسی کی پہلی تصنیف غزنوی دور کے شاعر ابو سعید احمد بن منشوری نے لکھی۔ خورشیدی نے اس کتاب کی شرح لکھی۔ محمد بن عمر رادیانی نے ترجمان البلاغہ کے نام سے فارسی میں بلاغت کی کتاب لکھی ہے۔ ان سب میں عربی نمونوں کی پیروی کی گئی ہے۔ بلاغت کے یہ موضوعات فارسی کے ذریعے اردو میں منتقل ہوئے۔ اردو تنقید کی ابتدائی پرورش چونکہ فارسی تنقید کے زیر سایہ ہوئی۔ اس لیے اس موضوع کے حوالے سے بھی مطالعہ ضروری ہے۔ فارسی میں تنقید کے لیے نقد کی اصطلاح مروج رہی ہے۔ فارسی نقد کا اساسی ہیولہ ہمیں تذکروں میں ملتا ہے اور مختلف ادوار کے تخلیق کار ادب پاروں کی تشریح و توضیح اور تحسین و تردین کے لیے مختلف اصول تشکیل دیتے رہے ہیں جن کو سمجھا کرنے سے تنقیدی اصول سامنے آئے ہیں۔ یہی تنقیدی اصول بعد میں اردو شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر کے لیے مستعمل رہے ہیں۔ فارسی کی جملہ اصناف شعر، قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی، مرثیہ، خط، ترکیب بند، ترجیع بند، حتیٰ کہ شہر آشوب اور اسوخت بھی اردو میں منتقل ہوئیں۔ فارسی میں تنقید کی اصطلاح رائج نہیں رہی۔ اس

کی جگہ نقد کی اصطلاح مستعمل ہے۔ ان معنوں میں انتقاد کا لفظ بھی دیکھنے میں آتا ہے لیکن بہت کم نقدِ ادبی اور نقدِ شعر کی اصطلاحیں زیادہ عام ہوئی ہیں۔ فارسی میں نثر کے بارے میں کہیں کہیں تنقیدی اشارے مل جاتے ہیں مگر فارسی تنقید کا غالب حصہ شاعری کے اصول انتقادیات پر ہی مبنی ہے۔ جس وقت فارسی شاعری کا آغاز ہوا اس وقت ملک میں عربی کا دور دورہ تھا۔ فارسی شعراء کے سامنے عربی شاعری کے نمونے تھے اور وہ اُنہی کی پیروی کر رہے تھے۔ تنقید میں بھی وہ عربی اصولوں ہی پر سختی سے عمل کر رہے تھے۔ عربوں کی شاعری کا نظام اوزان عروض پر مبنی تھا۔ ایرانی بھی اس کی پابندی کر رہے تھے حالانکہ ایرانیوں کا اپنا نظام اوزان بھی تھا مگر وہ آہستہ آہستہ متروک ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ عروضی اوزان نے لے لی۔ عربی تنقید کے اصول فارسی میں آئے اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئے۔ اس طرح سے اردو تنقید کا رشتہ بالواسطہ عربی تنقید سے قائم ہو جاتا ہے۔ فارسی کے تنقیدی اشارات یکجا نہیں ملتے۔ یہ مختلف عنوانات کے تحت مختلف کتب میں پائے جاتے ہیں:

(۱) شاعروں کی تنقید
- (الف) اقوال (موزوں/غیر موزوں)
- (ب) موازنے، محاکے اور ادبی مباحثے

(۲) تنقیدی کتب
- (الف) بدیع و بیان و معانی
- (ب) عروض و قوافی
- (ج) ادبی کتب

(۳) نثر نگاروں کی تنقید

(۴) شعراء کے تذکرے

فارسی تنقید کا تعلق بیشتر زبان و بیان اور اسلوب سے رہا ہے۔ اس میں شاعری کے معنوی پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ شاعروں کے کلام کو پرکھتے وقت معائب و محاسن سخن کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے اور ان دونوں کی بنیاد عروض و قوافی بدیع و بیان اور معنی و لغت پر ہے۔ اردو کی کلاسیکل تنقید نے فارسی تنقیدی اصولوں کی مکمل پیروی کی ہے۔ اردو تنقید کے مآخذ بھی فارسی تنقید سے ملتے جلتے ہیں۔ ان میں شعراء کی تنقید ان کے مناظرے، محاکے، فصاحت و بلاغت، ادبی کتب اور تذکرے شامل ہیں۔ فارسی کی طرح اردو کے ہر دور میں دو بڑے شاعر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں یا کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ جس طرح فارسی میں شاعری کے دبستان ہیں۔ اس طرح اردو میں بھی ہیں۔ فارسی کے جدید نقاد قدیم تنقید کو نقد ذوقی قرار دیتے ہیں۔ اس کا مفہوم تاثراتی تنقید سے زیادہ قریب ہے۔ فارسی ادب و تنقید کے بعد ہم مختصر سا جائزہ کلاسیکی و جدید مغربی تنقید کے حوالے سے لیتے ہیں۔ کلاسیکی مغربی تنقید کا آغاز یونان اور روم سے ہوتا ہے کیونکہ بیسویں صدی کے اردو ادب کو مغربی کے تنقیدی

اردو تنقید کے مآخذ بھی فارسی تنقید سے ملتے جلتے ہیں۔ ان میں شعراء کی تنقید ان کے مناظرے، محاکے، فصاحت و بلاغت، ادبی کتب اور تذکرے شامل ہیں، فارسی کی طرح اردو کے ہر دور میں دو بڑے شاعر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں یا کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ جس طرح فارسی میں شاعری کے دبستان ہیں

نظریات سے شناسائی کے بغیر ٹھیک طرح سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ خصوصاً اردو کی موجودہ تنقید پر مغربی اثرات بہت زیادہ گہرے ہیں گو کہ اردو ادب پر انیسویں صدی کے انگریزی ادب کا اثر زیادہ نمایاں ہے لیکن انگریزی ادب کے اثرات و محرکات کا سلسلہ یونانی اور رومی ادب تک جاتا ہے۔ جس چیز کو آج ہم مغربی تنقید کہتے ہیں۔ اس نے یونانی اور رومی ادب کے آغوش میں آنکھیں کھولیں۔ یونانی ادب میں تنقید سے قبل شاعری اور ڈراما اپنے نکتۂ عروج پر پہنچ چکے تھے۔ شاعری میں ہومر اور ہیسی اوڈ جیسے شاعر اور ڈراما نگاروں میں ایسکائیلس، سوفر کلیز، یوری پیڈیز اور ارسٹوفینز کے نام مقبول عام تھے۔ یونان میں تنقید کے سلسلے میں پہلا نام افلاطون کا آتا ہے اور اس کے بعد ارسطو کا یونانی تنقید کے لیے دو سرمائے ایسے ہیں اور ان کے افکار کی وقعت اتنی زیادہ ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک ادب اور شاعری کی پرکھ کے لیے انہی کے بنائے ہوئے پیمانے مستعمل رہے ہیں۔ ارسطو کے بعد یونانی تہذیب کا زوال اور رومی تہذیب کا عروج شروع ہوتا ہے۔ رومی تنقید میں ہورلیس اور کوئن ٹی لین کے اسما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح جدید مغربی تنقید کا آغاز سولھویں صدی کے نشاۃ الثانیہ کے دور سے ہوتا ہے۔ سولھویں صدی سے قبل اور ارسطو کے بعد کا زمانہ یورپ میں تاریک دور کہلاتا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں یورپ کے اندر ایک زبردست فکری انقلاب آیا اور اس نے ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا۔ آج کا جدید یورپ اس نشاۃ الثانیہ کے سہارے پر استوار ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے ابتدائی تنقید نگاروں میں فلپ سڈنی اور جان ڈرائیڈن کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ دانتے گو جو کہ اپنے نظریات کے حوالے سے کلاسیکی فکر کے قریب ہے یورپ کے تاریک دور کے دوران ارسطو کے بعد یورپ میں ناتے کو سب سے زیادہ قبول عام ہوا۔ اپنی ادبی تحریروں اور تنقیدی نظریات کے باوصف دانتے کی حیثیت کلاسیکی اور نوکلاسیکی ادوار کے درمیان ایک کڑی کی مانند ہے۔ دانتے نے لاطینی زبان کو چھوڑ کر دیسی زبان یعنی اطالوی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہی نظریہ آگے چل کر یورپ کے افکار کی بنیاد بنا۔ اردو میں تنقید کے متعدد دبستان ہیں، جن میں سے ایک کا نام رومانی دبستان تنقید ہے۔ رومانوی تنقید اپنی کچھ خصوصیات کی بناء پر تنقید کے دیگر دبستانوں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ انگریزی میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہمارے ناقدین بھی انہی تحریروں سے استفادہ کرتے ہیں۔ رومانیت میں شعراء کا سرچشمۂ قوت، ابہام سمجھی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ فعال اور قوی تخیل اپنی انفرادی حیثیت میں بذات خود ابہام کی سطح تک جا پہنچتا ہے۔ شدت جذبات شاعر کے لیے محرک کا کام کرتی ہے۔ شاعری کا مقصد حصول مسرت ہے۔ ورڈز ورتھ فطرت پرست تھا۔ رومانوی شعراء و ناقدین نے حسن کی عکاسی پر بھی بہت زور دیا کیونکہ حسن اور اس سے وابستہ

احساسات اور تعینات انسان کی روح پر صحت مند اثرات ڈالتی ہیں۔ بقول کیٹس:

"A thing of beauty is a joy forevrer"

اسی طرح کولرج بھی زبان کی اہمیت کا بہت زیادہ قائل تھا۔ کولرج نے نقاد کے منصب پر بطور خاص قلم اٹھایا، وہ مختلف زبانوں اور ممالک کی بہترین تخلیقات کے مطالعہ اور تقابل پر بھی زور دیتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط کے انگلستان کے لحاظ سے رومانیت کا دبستان شعر و نقد کلاسیکیت کے خلاف ردِعمل اپنے زمانہ کا تقاضا تھا۔ آنے والے زمانے میں اس پر شدید اعتراضات بھی ہوئے۔ عمرانی، مارکسی اور نفسیاتی دبستانوں سے متعلق ناقدین نے اس پر اعتراضات کیے۔ جب اس تناظر میں رومانویت کا مطالعہ کریں تو نثر میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری کے فکشن یعنی خیالستان اور کیوپڈ اور سائیکی کا نام سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد حجاب امتیاز علی تاج کے افسانے اور میرزا ادیب کے ''صحرا نورد کے خطوط اور صحرا نورد کے رومان'' آتے ہیں جبکہ شاعری میں اختر شیرانی کی سلمیٰ اور عذرا ہیں۔ انھی کی بدولت وہ شاعر رومان کہلواتے ہیں۔ اردو میں رومانوی تنقید اور ناقدین کے مطالعہ کے سلسلے میں سب سے بڑی الجھن یہی ہے کہ جب خود انگریزی میں رومانیت اور اس سے متعلق اصطلاحات کے مفاہیم میں قطعیت ملتی ہے تو پھر اردو میں ان کے درست مفاہیم کا کیسے تعین ہوسکتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک خرابی یہ بھی رہی ہے کہ اردو ناقدین انگریزی کتابوں سے آراء اقتباسات اور اصطلاحات اخذ کرتے وقت انھیں اصل انگریزی متن اور سیاق و سباق سے الگ کر کے اپنے ذاتی مفہوم میں استعمال کرتے رہتے ہیں جس کا غلط اثر پڑتا ہے اور تفہیم و تحقیق میں الجھن بھی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے تو ایک نقاد نیاز فتح پوری کو تاثراتی نقاد بتاتا ہے تو دوسرا جمالیاتی اور تیسرا رومانی بظاہر یہ تینوں دبستان قریب قریب اور بعض کو مترادف نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت تینوں کا جدا گانہ دائرہ کار ہے۔ رومانیت میں چار امور پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ (۱) تخیل، (۲) جذبہ، (۳) زبان، (۴) حصول مسرت۔ اگر اردو کا کوئی نقاد ان اصولوں کی روشنی میں ادبی تخلیقات کی تحسین و تفہیم کرے تو بلاشبہ وہ نقاد رومانوی کہلوانے کا مستحق ہوگا۔ اردو شعراء کے تذکرے کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو تنقید کے ابتدائی نقوش ان تذکروں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے شعراء کے مختصر حالات ان کے کلام کا انتخاب دیا ہے اور اس پر تبصرہ کیا ہے۔ کہیں شعراء کا موازنہ کیا اور کہیں محاکے کی صورت پیدا کی ہے۔ شعراء کے لطائف اور چٹکلے درج کیے ہیں۔ ان کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل دی ہے۔ ان سب میں تنقیدی اشارات ملتے ہیں جو اپنی جگہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز انیسویں صدی کے آواخر میں انجمن پنجاب لاہور میں محمد حسین آزاد کے لیکچر سے ہوا۔ آزاد کے بعد اردو میں تنقید کو باضابطہ اور فکر انگیز بنانے میں حالی کا مقصد شعر و شاعری انتہائی اہمیت کا حامل

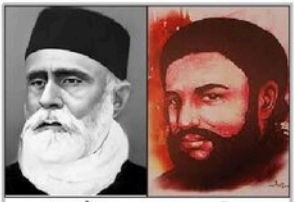

میر تقی میر　　الطاف حسین حالی

ہے اور آج تک موضوع گفتگو ہے۔ حالی کے بعد شبلی نعمانی، امداد الامام اثر اور مسعود حسین رضوی قابل ذکر نقاد ہیں، جنھوں نے حالی کے قائم کردہ ادبی تنقید کے شعور کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس دور کو ہم اردو تنقید کا دور اول کہہ سکتے ہیں۔ جدید اردو تنقید کا سنجیدہ اور بطور ایک شعبہ ادب کا باقاعدہ آغاز ترقی پسند تحریک کے آغاز سے ہوتا ہے۔ ترقی پسند تنقید کی حمایت اور مخالفت میں لکھی گئی تنقید نے اپنی وقعت اور اہمیت کو منوایا اور ہر دو سمت سے بہت سے نام اور نقاد سامنے آئے۔ ترقی پسند نقادوں میں جہاں ابتدائی طور پر سید سجاد ظہیر، آل احمد سرور اور اختر حسین رائے پوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہاں مجنوں گورکھپوری، پروفیسر احتشام حسین، علی سرور، ادا جعفری، اختر انصاری، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر محمد حسن، ممتاز حسین اور ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ نے ادب کو زندگی کے ساتھ جوڑ کر دیکھنے کی جس راویت کا آغاز کیا اور ادب میں جن موضوعات کا تقاضا کیا، وہ آج تک اہمیت کا حامل ہے۔

پاکستان میں ترقی پسند تنقید کے فروغ میں محمد علی صدیقی، ڈاکٹر عتیق احمد، ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر سلیم اختر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسند تنقید کے متوازی حلقہ ارباب ذوق کی طرف سے تنقید کا آغاز ہوا، حلقہ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والے ناقدین میں میراجی، مولانا صلاح الدین احمد، ریاض احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، جیلانی کامران اور مظفر علی سید وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ محمد حسن عسکری قیام پاکستان سے قبل ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے لیکن بعد میں ان کا شمار منحرفین میں ہوا۔ یوں تو اردو تنقید نگاروں کی فہرست کافی طویل ہے تاہم کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، سید وقار عظیم، سید عابد علی عابد، سید عبداللہ، مظفر علی سید، سلیم احمد، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، جیلانی کامران، فتح محمد ملک، تحسین فراقی، شہزاد منظر کے علاوہ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر بشیر سیفی اور نئی نسل کے بہت سے نقاد اس شعبے میں بڑے خلوص سے لکھ رہے ہیں۔ اردو میں بالعموم جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کو مترادف سمجھا جاتا ہے، جس کے باعث ایک نقاد ایک ہی وقت میں جمالیاتی اور تاثراتی نقاد قرار پاتا ہے۔ یہ دونوں دبستان جداگانہ خصوصیات کے حامل ہیں اور ان سے وابستہ ناقدین مطالعۂ ادب تخلیقات کی تحلیل میں الگ الگ طریقے استعمال کرتے ہیں۔ انگریزی میں والٹر بیٹر جمالیاتی تنقید کا اہم علمبردار ہے۔ وہ ادب برائے ادب اور ادب برائے مسرت کا قائل تھا۔ جدید دور میں اطالوی فلاسفر کروچے کے تصور اظہاریت نے فلسفۂ جمال اور جمالیاتی تنقید پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ جمالیاتی تنقید کے قدیم ناقدین کے نمونوں میں محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' اور شبلی نعمانی کی ''شعر العجم'' کا اس حوالے سے نام لیا جاسکتا ہے۔ اردو میں جمالیاتی تنقید کی

بہت اچھی مثال نیاز فتح پوری کی صورت میں ملتی ہے۔ وہ جمال پرست تھے اور یہی رویے ان کی عملی تنقید میں نمایاں تر ہیں۔ اس کے بعد عابد علی عابد ہیں اگرچہ مجنوں گورکھ پوری نے ایک مختصر کتاب ''تاریخِ جمالیات'' لکھی لیکن انھوں نے اس نقطۂ نظر سے تنقید نہیں کی ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی کتب جمالیاتی تنقید کے حوالے سے دیکھنے میں آتی ہیں۔ نیاز فتح پوری کو بیک وقت جمالیاتی اور تاثراتی نقاد کہا جاتا ہے۔

اردو تنقید کا مطالعہ کرنے پر فراق گورکھ پوری تنقید کی کامیاب ترین مثال قرار دیے جا سکتے ہیں۔ آج کل بالعموم کتابوں کی تقریبات رونمائی، دیباچوں اور فلیپ کی صورت میں جو تنقید لکھی جا رہی ہے اس کا شمار بھی تاثراتی تنقید ہی میں ہوتا ہے، ان میں فکری اور فنی حوالوں سے تجرباتی مطالعہ خال خال ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اردو ادب کی ایک ایسی تحریک ہے جس نے ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دیتے ہوئے ادب کے افادی پہلو پر زور دیا۔ برصغیر میں ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے زمانہ کے لحاظ سے ایک باغیانہ متنازعہ تحریک تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاسیس سے ربع صدی قبل ہی پریم چند ترقی پسند افسانے اور ناول قلم بند کر رہے تھے۔ گویا پریم چند ہی ترقی پسند ادب کی تحریک کے پہلے رکن تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، احمد علی، مجنوں گورکھ پوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، بلونت سنگھ، شوکت صدیقی، غلام عباس وغیرہ جبکہ خواتین میں عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، زاہدہ حنا وغیرہ ناول میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، اے حمید، اختر جمال وغیرہ۔ شاعری میں حسرت موہانی، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری اور ادا جعفری وغیرہ۔ ترقی پسند ادیبوں نے طنز کو کامیاب ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، کنہیالال کپور کی تحریریں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جنھوں نے ترقی پسندی کے تصور سے وابستہ فکری اور نظریاتی بحثوں پر قلم اٹھایا۔

ترقی پسندی جامد تصور حیات نہیں اس لیے پاکستان کے مخصوص سیاسی، سماجی، اقتصادی اور عمرانی

اردو تنقید کا مطالعہ کرنے پر فراق گورکھ پوری تنقید کی کامیاب ترین مثال قرار دیے جا سکتے ہیں، آج کل بالعموم کتابوں کی تقریبات رونمائی، دیباچوں اور فلیپ کی صورت میں جو تنقید لکھی جا رہی ہے اس کا شمار بھی تاثراتی تنقید ہی میں ہوتا ہے

حالات کے مطابق ترقی پسندانہ مقاصد میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ پاکستان کے تنقیدی منظرنامے پر اس وقت نفسیاتی، ساختیاتی، عمرانی، جمالیاتی دبستانوں سے وابستہ ناقدین سرگرم عمل ہیں اور ان میں ترقی پسند ناقدین بھی ہیں جو اپنی انفرادی حیثیت میں اجتماعیت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اردو میں

ڈاکٹر وزیر آغا — سجاد باقر رضوی

نفسیاتی تنقید بھی اپنی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ خاصی دیر تک میراجی کو پہلا نفسیاتی نقاد سمجھا جاتا رہا مگر حقیقت یہ نہیں۔ میراجی سے بہت پہلے امراؤ جان ادا کے مصنف مرزا ہادی رسوا کی اس انداز کی تحریریں ملتی ہیں۔ مرزا رسوا کے بعد جن ناقدین کی تحریروں میں نفسیاتی بصیرت جزوی طور پر ملتی ہے۔ ان میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (محاسن کلام غالب) اور وحید الدین سلیم (افادیتِ سلیم) کا نام لیا جا سکتا ہے، ان کے بعد میراجی کا نام آتا ہے۔ پاکستان میں ایسے ناقدین ملتے ہیں جو کلی طور پر نفسیات سے شغف نہ رکھنے کے باوجود بعض اوقات مطالعۂ ادب میں نفسیات سے کام لینے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں محمد حسن عسکری، ریاض احمد، سلیم احمد وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے، یہ سب فرائیڈ سے متاثر ہیں۔

بھارت میں ڈاکٹر سید محمود احسن رضوی نے ''اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر'' لکھ کر لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالے کا نام ''نفساتی تنقید' ہے، اردو ادب میں ساختیاتی تنقید کا نظریہ نسبتاً نیا ہونے کے باوجود بھی خاصا دلچسپ ہے۔ ساختیات کے بنیادی اصول سوئٹزرلینڈ کے ایک ماہر لسانیات فراڈی نیڈ ڈی ساسر کے مجموعۂ مضمون Course De Linguistique General سے ماخوذ ہے۔ اردو میں ساختیاتی تنقید کا نظریہ ۱۹۸۰ء کے بعد ناقدین کی بھرپور توجہ کا مرکز بنا۔ ساختیاتی تنقید کے مطابق نقاد فن پارے کے تشریح کرنے کی بجائے اس کے لسانیاتی نظام کی ساخت کا تجزیہ کرنے کے بعد نئے معنی تخلیق کرتا ہے، مختصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساختیاتی تنقید میں تخلیق اور صنف کے بجائے قاری یا ناقد کو اہمیت حاصل ہوتی ہے یعنی اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا کہ تخلیق کرتے وقت تخلیق کار کے ذہن میں تخلیق کے کیا معنی تھے بلکہ یہ ضروری امر سمجھا جاتا ہے کہ زبان کی ساخت قاری یا ناقد کو کس معانی کی طرف لے جاتی ہے اور ناقد تخلیق سے کیا معنی اخذ کرتا ہے۔ یہی ساختیاتی تنقید کے مربوط اصول وضوابط ہیں جن پر چلنے والا ناقد ساختیاتی تنقید نگار کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ ماہرین ساختیات اس میں مزید ترمیم کی گنجائش بھی رکھتے ہیں اور نشاندہی کر سکتے ہیں۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ کھرے اور کھوٹے کے فرق کو سمجھنے پر عمل کیا جائے اور تنقید جو کہ باضابطہ علم اور ادب کی روح ہے، اس کو حقیقی معنوں میں سمجھا جائے!

کتب برائے حوالہ جات

۱۔ اشاراتِ تنقید، ڈاکٹر سید عبداللہ؛

۲۔ تنقید کیا ہے؟، آل احمد سرور؛

۳۔ تنقیدی دبستان، ڈاکٹر سلیم اختر؛

۴۔ آبِ حیات، مولانا محمد حسین آزاد؛

☆☆☆☆

سید باقر حسین

ترجمے کے اصول

ابھی چند روز کی بات ہے کہ میں نے ایک انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ شروع کیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ایک بحرِ بے کنار ہے اور میں ایک چھوٹی سی کشتی چپو کی مدد سے چلا رہا ہوں۔ قدم قدم پر زبردست لہریں ملتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی اب ڈوبی اور تب ڈوبی لیکن کوشش اور ہمت ابھی تک سہارا دیتی رہی ہے۔ کہنے کو تو یہ محض استعارہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری دلی کیفیات کی ترجمانی اس سے بہتر نہیں ہوسکتی۔

چند ہفتے قبل تک میں ان لوگوں میں تھا جو اُردو کو ایک بہت گراں مایہ زبان سمجھتے ہیں اور اسے ہر خیال کو ادا کر سکنے کے قابل تصور کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس ترجمے کے کام نے مجھے اپنا خیال بدلنے پر مجبور کر دیا ہے اور اب میرا عقیدہ یہ ہے کہ اُردو کی گراں مائیگی صرف شعر و ادب اور اس کے مخصوص درباری تہذیب تک ہے، جو ہمارے پیشرو ہمارے لیے ورثہ میں چھوڑ گئے ہیں۔

میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی زبان کیوں نہیں بول سکتا اور کیوں اسے تقریباً ہر جملے میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ اب سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُردو میں ابھی تک وہ الفاظ ہیں ہی نہیں جو مغرب سے آئے ہوئے خیالات کو ادا کر سکیں۔

اور یہ بات کچھ اصطلاحات ہی تک محدود نہیں ہے، اُردو میں اصطلاحات کا نہ ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں کیونکہ جب علوم و فنون ہی نہیں تو اصطلاحات کہاں سے آئیں گی غضب تو یہ ہے کہ ترقی یافتہ زبانوں میں جو عام بول چال کے الفاظ ہیں ان سب کے مترادفات بھی اُردو میں موجود نہیں ہیں۔ شاید بعض لوگوں کو یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہو۔ ان کی تشفی کے لیے صرف تھوڑے سے ایسے عام الفاظ دیے جاتے ہیں جن کے مترادفات کم از کم میری دانست میں اُردو میں اب تک موجود نہیں ہیں:

Confidential, Vulnerable, Public, Explosive, Civil, Sleek, Manning, Streamlined, Mood, Graceful, Policy

اس قسم کے الفاظ کی سیکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن میرے دعوے کے ثبوت کے لیے غالباً اتنی ہی کافی ہیں۔

> ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی زبان کیوں نہیں بول سکتا اور کیوں اسے تقریباً ہر جملے میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہے، اس کی ایک بڑی وجہ اب سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُردو میں ابھی تک وہ الفاظ ہیں ہی نہیں جو مغرب سے آئے ہوئے خیالات کو ادا کر سکیں

میں ان کوششوں سے بے خبر نہیں ہوں جو ریاست حیدر آباد مرحوم میں درسی اور غیر درسی کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی گئی ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اصطلاحی اور غیر اصطلاحی الفاظ کی فرہنگیں بھی مرتب کی جا چکی ہیں۔ لیکن ان کوششوں کا دائرہ اثر زیادہ تر حیدر آباد ہی تک محدود رہا اور جو الفاظ اور اصطلاحات حیدر آباد میں بالعموم استعمال کیے جاتے تھے، حیدر آباد سے باہر ان کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ غلط نہیں کہ حیدر آبادی الفاظ اور اصطلاحات اُردو میں عام طور پر کبھی رائج نہیں ہو سکے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اُردو کی بجائے کسی اور زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کے حق میں ہوں۔ یا اُردو کی کم مائیگی کا ذکر بطور استحقار کر رہا ہوں۔ نہیں۔ یہ اُردو کی محبت ہی ہے جو مجھے نہایت افسوس کے ساتھ صاف گوئی پر مجبور کر رہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ ہم اظہارِ مطلب کے لیے انگریزی کے اس درجہ دست نگر ہیں۔

یہاں ایک ممکن غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اُردو کی تہی دامانی سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس میں امکانی قوتوں کا بھی فقدان ہے یا یہ کہ اس میں ترقی کی گنجائش ہی نہیں۔ ایسا سمجھنا بالکل خلافِ واقعہ ہوگا۔ اُردو کے بڑے ماخذ تین ہیں۔ عربی، فارسی اور ہندی اور ان تینوں میں کم و بیش ایسی خصوصیات ہیں جو ترجمے کے کام میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔ عربی کی قواعد کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک ہی لفظ کے بہت سے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ فارسی زبان اپنی لطافت اور شیرینی اور شعریت کی وجہ سے ترجمے میں چار چاند لگا دیتی ہے اور بعض اوقات ہندی سے بھی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو اپنی گویائی کے لحاظ سے لا جواب ہوتے ہیں۔ جس زبان کو تین تین زبانوں کی امداد حاصل ہو اس میں ترجمہ کرنے کا کام بہت دشوار نہیں ہونا چاہیے۔

ترجمے کے کام میں انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ سیکڑوں انگریزی الفاظ اُردو میں داخل ہو کر اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کا ترجمہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بلا تکلف اُردو کے الفاظ کی طرح استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے الفاظ کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بہت سے انگریزی الفاظ ایسے ہیں، جو باوجود پشتوں سے استعمال ہونے کے ابھی تک اُردو کا جزو نہیں بن سکے اور ان کا بدیسی پن صاف نظر آتا ہے۔ ایسے الفاظ کی دو قسمیں ہیں اول وہ جو ہو بہو یا اُردو لب و لہجہ کے مطابق خفیف ترمیم کے ساتھ اپنائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً

Studio	استودیو	Technique	تکنیک
Stanza	استنزا	Romance	رومان
Propaganda	پروپیگنڈا	Sonnet	سانیت
Mechanical	میکانیکی	Position	پوزیشن

اور دوسرے وہ جو اُردو سے بالکل میل نہیں رکھتے۔ ایسے الفاظ کے مترادف تلاش کرنے پڑیں گے۔

الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ اصول ہیں۔ الفاظ کا ترجمہ کرنے میں میری رائے میں مندرجہ ذیل اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے:

۱۔ ترجمہ صحیح ہونا چاہیے۔
۲۔ حتی الامکان عام فہم ہونا چاہیے۔
۳۔ سبک اور خوبصورت ہونا چاہیے۔

ترجمے کا صحیح ہونا بہرحال ضروری ہے، کیونکہ جو تصور اصل میں ہے وہ اگر نقل میں ادا نہیں ہوتا یا اصل کی سی شدت کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو ایسا ترجمہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہوسکتا۔

ترجمے کا حتی الامکان عام فہم ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر ترجمے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ترجمے کا مقصد تو یہ ہے کہ عوام کو ان تصورات سے روشناس کرایا جائے جو اصل میں موجود ہیں۔ اگر ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کے معنی معمولی تعلیم یافتہ طبقہ نہ جانتا ہو تو وہ ان تصورات کو کیا سمجھے گا؟

ترجمے کے سبک اور خوبصورت ہونے کی شرط زیادہ تر جمالیات کے نقطۂ نگاہ سے ہے لیکن اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ بھدا یا بھاری بھرکم لفظ استعمال کرنے سے بیان میں الجھاؤ اور گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور مطالب کے اظہار اور تفہیم دونوں میں دشواری ہوتی ہے لہٰذا ترجمے کا مقصد یوں بھی جیسا چاہیے پورا نہیں ہوتا۔

ان تینوں شرائط پر برابر توجہ دینا مشکل ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کا ترجمہ سب شرطوں پر پورا اترے۔ مثال کے طور پر انگریزی کا لفظ Blast لیجیے۔ اصطلاح میں اس لفظ کے معنی ہیں ''ہوا کا سخت جھونکا جو بم گرنے کے بعد چلتا ہے۔'' اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ بعض تھپیڑے'' کے سوا اور کوئی لفظ Blast کا مترادف نہیں مل سکا۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ نہ تو سبک سے اور نہ خوبصورت، لیکن چونکہ باقی دو شرطوں پر پورا اترتا ہے، یعنی صحیح اور عام فہم ہے، اس لیے مجبوراً اسی کو اختیار کرنا پڑا۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے عربی کے مقابلے میں فارسی الفاظ اُردو دانوں کے لیے زیادہ عام فہم ہوتے ہیں، اور سبک اور خوبصورت بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

فارسی	عربی	انگریزی
تپش پیما	مقیاس الحرارت	Thermometer
بلند آواز	مکبر الصوت	Loud-speaker
آتش کش	قاطع النار	Fire-extinguisher
پرواز	طیران	Flight
تراشہ	قطعہ	Cutting

لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں۔ بعض اوقات عربی ترجمے بھی نہایت سبک اور حسین ہوتے ہیں، مثلاً:

مؤجل	Urgent	قاصد	Messenger
تقدیم یا تقدم	Priority	استقبال یا تصدیق یا تصویب (محل استعمال کے مطابق)	Confirmation
تلبیس	Camouflage	عکاسی	Photography

کبھی کبھی عربی اور فارسی کی آمیزش سے بہت خوبصورت ترجمہ ہوسکتا ہے، مثلاً

طیارہ بان	Pilot	طیارہ برد	Air-borne
خیر اندیش	Good-will		

یہ ضروری نہیں (اور کوئی اچھی بات بھی نہیں) کہ ہر لفظ کا لفظی ترجمہ کر دیا جائے۔ اصل عبارت میں اکثر الفاظ ایسے ملتے ہیں جو ایک خاص ماحول رکھتے ہیں اور ایک خاص تلازمۂ خیال پیش کرتے ہیں۔ اگر ترجمے میں آنکھ بند کر کے ان کے مترادف الفاظ رکھ دیے جائیں تو نتیجہ اکثر مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ Labour کا ترجمہ عام حالات میں محنت یا مشقت کرنا ٹھیک ہے لیکن کہیں اسپتال کے Labour Room کو محنت یا مشقت کا کمرہ نہ کہہ دیجیے گا۔ اسی طرح اگر I have to recruit about 500 labour کا ترجمہ آپ یوں کریں کہ مجھے تقریباً ۵۰۰ محنت بھرتی کرنی ہے، تو ممکن ہے آپ مترجم سمجھے جائیں لیکن معقول آدمی سمجھے جانے میں ذرا شک ہے۔

الفاظ کا ترجمہ کرنا پھر بھی نسبتاً آسان ہے، لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں دو متضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو، اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو، اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ہر زبان میں مخصوص اسالیب ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی ایسا اسلوب اظہار یا محاورہ تلاش کرنا پڑتا ہے جو اصل کا لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو۔ یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ترجمے میں جملے کی ساخت حسبِ ضرورت تبدیل کرنی پڑتی ہے اور یا الفاظ گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں، تاکہ مطلب حتی الامکان صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہو جائے۔ مثلاً ملاحظہ کیجیے:

> The common interests of mankind are numerous and weighty, but our existing political machinery obscures them through the scramble for power between different nations and different parties.

لفظی ترجمہ

انسان کے مشترک مفادات کثیر اور وزنی ہیں، لیکن ان کو ہماری موجودہ سیاسی مشینری مختلف قوموں اور جماعتوں کے کشاکشِ اقتدار کے ذریعہ دھندلا کر دیتی ہے۔

بامحاورہ ترجمہ جو حتی الامکان تحت اللفظ ہے

انسان کے مشترک مفادات کثیر اور وزنی ہیں، لیکن ہماری موجودہ سیاسی مشینری کچھ ایسی ہے کہ اس میں مختلف قوموں اور جماعتوں کے درمیان حصولِ اقتدار کے

الفاظ کا ترجمہ کرنا پھر بھی نسبتاً آسان ہے، لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ اس میں دو متضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے، ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو، اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ ہاتھ سے نہ جانے پائے

اوقات عمارتیں تک گر جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ لفظ ''جھونکا'' اس سارے مفہوم کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جھونکا اصل میں لفظ (Gust) کا ترجمہ ہے۔ میں نے بہت سوچا لیکن ''ہوائی

لیے کشاکش ہونا ضروری ہے اور یہ چیز ان مفادات کی اہمیت گھٹا دیتی ہے۔

اس ترجمے کی پہلی مثال صرف کہنے کو اُردو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سولاہیٹ کو ترکی ٹوپی کے قالب پر زبردستی چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری مثال میں کچھ الفاظ اپنی طرف سے بڑھائے گئے ہیں اور جملے کے آخری حصے کی ساخت کسی قدر بدل دی گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دوسرا جملہ اُردو کا معلوم ہوتا ہے اور سمجھ میں بھی آسانی سے آتا ہے۔

ہر زبان کے الفاظ میں ایک وزن اضافی ہوتا ہے۔ بظاہر اکثر الفاظ ہم معنی نظر آتے ہیں اور ایک ہی لفظ کے کئی کئی معنے ہوتے ہیں۔ لیکن گہری نظر ڈالنے سے ان الفاظ یا معانی میں نازک امتیازات قائم کیے جا سکتے ہیں بلکہ اکثر یہ امتیازات پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے الفاظ اُردو میں بظاہر ہم معنی ہیں:

عریاں۔ برہنہ۔ ننگا۔

لیکن ان کے محلِ استعمال پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بہت فرق ہے۔ لفظ ''برہنہ'' میں حقیقت اتنی بے لباس نہیں ہے۔ جتنی کہ لفظ ''ننگا'' میں ہے اور لفظ ''عریاں'' میں اس سے بھی کم ہے۔ اگر کہا جائے کہ ''بچہ ننگا ہے'' تو یہاں اس لفظ کا استعمال بالکل بامحل ہے۔ خیال فرمائیے کہ ''بچہ برہنہ یا عریاں ہے'' کہنے میں کس قدر قبل آ عوذیت پائی جاتی ہے! لیکن جب مرد یا عورت کا ذکر آئے گا تو بہ لحاظ حجابِ ستر لفظ ''برہنہ'' یا ''عریاں'' استعمال کرنا بالکل درست ہوگا۔ البتہ اگر پاگل مرد یا عورت کا معاملہ ہو تو اس کو عریانیت کا تیسرا درجہ دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ مطلق الفاظ کا ترجمہ ہو، یا عبارت کا، اس ''وزن اضافی'' کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں کے جملے اکثر پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر اور عام فہم ہو چکے ہیں اور مطلب سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی لیکن اُردو ابھی تک زیادہ پیچیدہ اور لمبے جملوں کی متحمل نہیں ہے۔ لہٰذا ترجمہ کرنے میں ایسے جملوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا بہتر ہوتا ہے اور یہ ہے کہ اُردو میں Site اور Space کے مترادفات تو موجود ہیں لیکن انھیں آسانی کے ساتھ Siting اور Spacing میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ مجبوراً نئے الفاظ گھڑنے پڑیں گے چنانچہ میری کوشش ملاحظہ ہو۔

گنجان علاقے میں نئی عمارات کی صحت مندانہ نہائش اور فصل آرائی ایک مشکل مسئلہ ہے۔

اس جملے کا سیدھا سادہ ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

گنجان علاقے میں نئی عمارتیں کہاں کہاں اور کتنے فاصلے پر بنائی جائیں، یہ ایک مشکل مسئلہ ہے۔

لیکن ایسا ترجمہ اُردو کے حق میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ Siting اور Spacing تشنہ ترجمہ رہ جاتے ہیں۔ اگر زبان کو وسیع بنانا ہے تو نئے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ترجمے میں بھی نئے الفاظ وضع کرنے چاہئیں۔

سطور بالا سے عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے حسب ذیل اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہونا چاہیے۔ اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے۔

۲۔ ترجمہ حتی الامکان محاورۂ زبان کے مطابق ہونا چاہیے۔

۳۔ الفاظ کے وزن اضافی کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں بھی باقی رہے۔

۴۔ حتی الامکان ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جن کے مترادفات اُردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے، خواہ وہ مترادف نامانوس ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کا تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہو، تو ایسی صورت میں جملے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔

زیادہ غور کرنے سے شاید اور اصول قائم کیے جا سکیں۔ لیکن موٹے موٹے اصول یہی ہیں۔

☆☆☆☆

ٹکڑے مناسب حروفِ عطف کی مدد سے آپس میں جوڑے جا سکتے ہیں۔ مثال:

Provision will also have to be made for the construction of baffle walls designed to afford protection against the blast and splinter effects of a 500 lbs. General Purposes Bomb falling at a distance of not less than 50 feet.

انگریزی کا یہ جملہ باوجود اتنا لمبا ہونے کے Simple ہے Complex یا Compound نہیں ہے لیکن اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے اس کے دو ٹکڑے کر لینا مناسب ہوگا، اس طرح:

ترقی یافتہ زبانوں کے جملے اکثر پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر اور عام فہم ہو چکے ہیں اور مطلب سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی لیکن اُردو ابھی تک زیادہ پیچیدہ اور لمبے جملوں کی متحمل نہیں ہے لہٰذا ترجمہ کرنے میں ایسے جملوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا بہتر ہوتا ہے اور یہ

۵۰۰ پونڈ کے ایک ہمہ مقصد بم کے کم از کم ۵۰ فٹ پر گرنے سے جو ہوائی تھپیڑا پیدا ہوتا ہے اور پرخچے اڑتے ہیں (حصہ نمبر:۱) ان کے اثرات سے عمارت وغیرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے حفاظتی دیواروں کی تعمیر کا بھی بندوبست کرنا ہوگا۔ (حصہ نمبر:۲)

ترجمہ کرنے میں اکثر یہ مشکل آ پڑتی ہے کہ بہ مقابلہ ترقی یافتہ زبانوں کے اُردو میں اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی سہولت تقریباً مفقود ہے۔ مثال دیکھیے:

The hygienic siting and spacing of new buildings in a crowded area presents a difficult problem.

اس جملے کا ترجمہ کرنے میں دشواری صرف یہ

لیے کشاکش ہونا ضروری ہے اور یہ چیز ان مفادات کی اہمیت گھٹا دیتی ہے۔

اس ترجمے کی پہلی مثال صرف کہنے کو اُردو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سولاہیٹ کو ترکی ٹوپی کے قالب پر زبردستی چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری مثال میں کچھ الفاظ اپنی طرف سے بڑھائے گئے ہیں اور جملے کے آخری حصے کی ساخت کسی قدر بدل دی گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دوسرا جملہ اُردو کا معلوم ہوتا ہے اور سمجھ میں بھی آسانی سے آتا ہے۔

ہر زبان کے الفاظ میں ایک وزن اضافی ہوتا ہے۔ بظاہر اکثر الفاظ ہم معنی نظر آتے ہیں اور ایک ہی لفظ کے کئی کئی معنے ہوتے ہیں۔ لیکن گہری نظر ڈالنے سے ان الفاظ یا معانی میں نازک امتیازات قائم کیے جا سکتے ہیں بلکہ اکثر یہ امتیازات پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے الفاظ اُردو میں بظاہر ہم معنی ہیں:

عریاں۔ برہنہ۔ ننگا۔

لیکن ان کے محلِ استعمال پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بہت فرق ہے۔ لفظ ''برہنہ'' میں حقیقت اتنی بے لباس نہیں ہے۔ جتنی کہ لفظ ''ننگا'' میں ہے اور لفظ ''عریاں'' میں اس سے بھی کم ہے۔ اگر کہا جائے کہ ''بچہ ننگا ہے'' تو یہاں اس لفظ کا استعمال بالکل بامحل ہے۔ خیال فرمائیے کہ ''بچہ برہنہ یا عریاں ہے'' کہنے میں کس قدر قبل آ عوذیت پائی جاتی ہے! لیکن جب مرد یا عورت کا ذکر آئے گا تو بہ لحاظ حاجتِ ستر لفظ ''برہنہ'' یا ''عریاں'' استعمال کرنا بالکل درست ہوگا۔ البتہ اگر پاگل مرد یا عورت کا معاملہ ہو تو اس کو عریانیت کا تیسرا درجہ دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ مطلق الفاظ کا ترجمہ ہو، یا عبارت کا، اس ''وزن اضافی'' کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں کے جملے اکثر پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر اور عام فہم ہو چکے ہیں اور مطلب سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی لیکن اُردو ابھی تک زیادہ پیچیدہ اور لمبے جملوں کی متحمل نہیں ہے۔ لہٰذا ترجمہ کرنے میں ایسے جملوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا بہتر ہوتا ہے اور یہ ٹکڑے مناسب حروفِ عطف کی مدد سے آپس میں جوڑے جا سکتے ہیں۔ مثال:

Provision will also have to be made for the construction of baffle walls designed to afford protection against the blast and splinter effects of a 500 lbs. General Purposes Bomb falling at a distance of not less than 50 feet.

انگریزی کا یہ جملہ باوجود اتنا لمبا ہونے کے Simple ہے Complex یا Compound نہیں ہے لیکن اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے اس کے دو ٹکڑے کر لینا مناسب ہوگا، اس طرح:

> ترقی یافتہ زبانوں کے جملے اکثر پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر اور عام فہم ہو چکے ہیں اور مطلب سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی لیکن اُردو ابھی تک زیادہ پیچیدہ اور لمبے جملوں کی متحمل نہیں ہے لہٰذا ترجمہ کرنے میں ایسے جملوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا بہتر ہوتا ہے اور یہ ٹکڑے مناسب حروفِ عطف کی مدد سے آپس میں جوڑے جا سکتے ہیں

۵۰۰ پونڈ کے ایک ہمہ مقصد بم کے کم از کم ۵۰ فٹ پر گرنے سے جو ہوائی تھپیڑا پیدا ہوتا ہے اور پرخچے اڑتے ہیں (حصہ نمبر:۱) ان کے اثرات سے عمارت وغیرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے حفاظتی دیواروں کی تعمیر کا بھی بندوبست کرنا ہوگا۔ (حصہ نمبر:۲)

ترجمہ کرنے میں اکثر یہ مشکل آ پڑتی ہے کہ بہ مقابلہ ترقی یافتہ زبانوں کے اُردو میں اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی سہولت تقریباً مفقود ہے۔ مثال دیکھیے:

The hygienic siting and spacing of new buildings in a crowded area presents a difficult problem.

اس جملے کا ترجمہ کرنے میں دشواری صرف یہ ہے کہ اُردو میں Site اور Space کے مترادفات تو موجود ہیں لیکن انھیں آسانی کے ساتھ Siting اور Spacing میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ مجبوراً نئے الفاظ گھڑنے پڑیں گے چنانچہ میری کوشش ملاحظہ ہو۔

گنجان علاقے میں نئی عمارات کی صحت مندانہ نہائش اور فصل آرائی ایک مشکل مسئلہ ہے۔

اس جملے کا سیدھا سادہ ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

گنجان علاقے میں نئی عمارتیں کہاں کہاں اور کتنے فاصلے پر بنائی جائیں، یہ ایک مشکل مسئلہ ہے۔

لیکن ایسا ترجمہ اُردو کے حق میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ Siting اور Spacing تشنہ ترجمہ رہ جاتے ہیں۔ اگر زبان کو وسیع بنانا ہے تو نئے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ترجمے میں بھی نئے الفاظ وضع کرنے چاہئیں۔

سطور بالا سے عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے حسب ذیل اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہونا چاہیے۔ اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے۔

۲۔ ترجمہ حتی الامکان محاورۂ زبان کے مطابق ہونا چاہیے۔

۳۔ الفاظ کے وزن اضافی کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں بھی باقی رہے۔

۴۔ حتی الامکان ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جن کے مترادفات اُردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے، خواہ وہ مترادف نامانوس ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کا تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہو، تو ایسی صورت میں جملے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔

زیادہ غور کرنے سے شاید اور اصول قائم کیے جا سکیں۔ لیکن موٹے موٹے اصول یہی ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر عارف حسین، اسلام آباد

علامہ اقبال اور تعلیم و تربیت کا مثالی نظام

علامہ محمد اقبالؒ برصغیر کے ایک عظیم مفکر، شاعر، فلسفی اور مصلح تھے جنھوں نے نہ صرف مسلمانوں کو ان کی گمشدہ خودی کا شعور دیا بلکہ تعلیم و تربیت کے ایسے اصول و نظریات ان کے سامنے پیش کیے جو آج بھی ہمارے تعلیمی نظام کی اصلاح کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ علامہ اقبال کا تصورِ تعلیم محض کتابی علم یا روزگار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک ایسی روحانی و فکری تربیت ہے جو انسان کو اپنے مقام و منزل کا شعور عطا کرتی ہے۔ اقبال کے تصورِ تعلیم کا بنیادی فلسفہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے کیونکہ اقبال نے قرآن کا مطالعہ جس گہرائی سے کیا ہے اس سے صاف طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات کو اپنے افکار کی اساس بنا کر افکار میں بیان کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی تاثیر ان کے کلام اور تعلیمات میں موجزن ہو کر ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے۔

اقبال شاعر اور فلسفی دونوں حیثیتوں میں قوم کے حقیقی راہنما تھے۔ انھوں نے بلاشک و شبہ ثقافت کے طبیب کا فرض ادا کیا اور اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کر کے ایک نئے علم کلام کی تعمیر، اسلامی فقہ کی ایک نئی تفسیر اور الٰہیات اسلامیہ کی از سرِ نو تشکیل پر زور دیا اور تعلیم کو ان مقاصد کے حصول کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ تعلیم کے حوالے سے اقبال کا یہ خیال ہے کہ:

اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا
ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نشتر

تعلیم کے تین بنیادی پہلو ہیں: فلسفیانہ یا مذہبی پہلو، معاشرتی پہلو اور نفسیاتی پہلو فلسفہ یا مذہب وہ بنیادی عقائد و اقدار فراہم کرتے ہیں جن پر کسی معاشرے کی اساس استوار ہوتی ہے۔ ان عقائد اور اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے جو علم، مہارتیں اور رویے کسی معاشرے میں رواج پاتے ہیں ان کی تنظیم و ترتیب کا کام عمرانیات انجام دیتی ہے۔ علم، مہارتوں اور رویوں اور ان میں مضمر عقائد و اقدار کو کامیابی کے ساتھ نئی نسل میں منتقل کرنے کا طریقہ نفسیات مہیا کرتی ہے۔ فلسفہ یا مذہب، عمرانیات اور نفسیاتِ تعلیم کے ماخذ ہیں جن میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کر کے تعلیم کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔

اقبال شاعر اور فلسفی دونوں حیثیتوں میں قوم کے حقیقی راہنما تھے، انھوں نے بلاشک و شبہ ثقافت کے طبیب کا فرض ادا کیا اور اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کر کے ایک نئے علم کلام کی تعمیر، اسلامی فقہ کی ایک نئی تفسیر

تعلیم کے جدید فلسفوں میں صرف تدریسی مسائل پر توجہ دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ فلسفیانہ (مذہبی) اور عمرانی مسائل پر ان میں بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ فلسفہ تعلیم کی اہمیت اگر کم ہو جائے اور صرف تعلیمی مقاصد رکھنے والے عملی اُصول اس کی جگہ لے لیں۔ تعلیم کا اہم فلسفیانہ مسئلہ یہ نہیں کہ پڑھایا کس طرح جائے؟ اس کا تعلق تو نفسیات سے ہے جو ایک طبعی سائنس ہے۔ اس کی فلسفیانہ جہت کا تعلق زندگی اور علم کی ماہیت و ماخذ کے متعلق نظریات، روایت اور تغیر سے متعلق عمرانی تصورات اور اخلاق و مذہب پر مبنی عقائد و اقدار سے ہے۔ ایک کامیاب فلسفہ تعلیم کے لیے لازم ہے کہ وہ زندگی، علم اور اقدار سے متعلق فلسفیانہ یا مذہبی نظریات پر مبنی معاشرے کے فلسفہ حیات سے ایک مربوط فکری نظام مرتب کرے جو تعلیمی عمل کے لیے اساس کا کام دے سکے۔

اقبال نے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۳۰ء کے دوران تحریروں میں تعلیم کے لیے نفسیات، مذہب (فلسفہ) اور عمرانیات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بچوں کی تعلیم و تربیت پر اپنے ایک مضمون میں (جو جنوری ۱۹۰۲ء کے رسالہ مخزن میں شائع ہوا) انھوں نے اساتذہ کے لیے بچوں کی نشوونما کے اصولوں کا مطالعہ لازمی قرار دیا۔ اساتذہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون سے اُمور ہیں جو عالمِ طفلی کے ساتھ مختص ہیں تاکہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں ان کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور ان سے باحسن طریقے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ تعلیم کو نفسیاتی رنگ دینے کے بعد، قومی زندگی پر اپنے مضمون مطبوعہ مخزن، اکتوبر ۱۹۰۴ء اور دسمبر ۱۹۱۰ء کے ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' میں اپنے خطبہ علی گڑھ میں انھوں نے تعلیم کو ایک طرف مذہبی عقائد و اقدار اور دوسری طرف معاشرے کی ضروریات کا پابند بنایا۔ مذہب کی اہمیت کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بدلتی ہوئی روحانی ضروریات کبھی بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئیں۔

جس طرح افلاطون تصورات کی دنیا میں غرق ہو گیا تھا اور اس کے لیے فلسفہ ہی سب کچھ تھا اور وہ اپنی زندگی میں دن رات اسی موضوع پر کام کرتا رہا۔ اسی طرح اقبال کے لیے تصور کی بجائے عمل ہی وہ کامیابی کی کنجی سمجھی جاتی ہے جس میں غرق ہو کر اقبال خیر کثیر کے وہ تصورات پیش کرتا ہے جس سے بڑے بڑے فلسفی اقبال کے معترف ہو جاتے ہیں کیونکہ اقبال کا عقیدہ ہے کہ جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی۔ عمل اور خیر دونوں کا تعلق طرب زارِ تخیل سے نہیں بلکہ دنیائے آب و گل سے ہے۔ جیسا نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ:

الدنیا مزرعۃ الآخرۃ
''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔ (۱)

فلسفی اپنے اندر ایک ایسی سوچ بچار رکھتا ہے جو کہ ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ وہ ہر وقت اپنے معاشرہ کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے فکر مند رہتا ہے۔ اُسے ہمیشہ یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ قوم ترقی کس طرح کر سکتی ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں جنھیں فروغ دے کر معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔ فلسفی کے مفہوم کی کچھ اس طرح سے وضاحت کی گئی ہے:

"فلسفی ادبیت کا خاموش تماشائی نہیں بلکہ اس کے تقاضوں کو عملی جامہ پہنانے کا داعی ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے بلکہ اس کی اصل غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے"۔(۲)

جب یہ محسوس ہو کہ اس نظام کی زندگی کی اعلیٰ رفعتوں تک رسائی نہیں رہی ہے تو اس کی از سرِ نو تشکیل کی جائے۔ اس مفہوم میں فلسفی معاشرے کا محافظ ہے، ثقافت کا طبیب ہے، دیدۂ بینائے قوم ہے جو جامد معاشرے میں حرکت کی روح پھونکتا ہے، ابدیت کے جو تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے یقین اور اعتماد کے ساتھ قدم آگے بڑھاتا ہے۔ ابدیت کو زندگی میں ایک رواں دواں قوت بنانے کا انحصار تعلیم پر ہے کیونکہ ثقافتی ورثے کو نئی نسل میں منتقل کر کے اس کا تحفظ کرنا ہی نہیں بلکہ علم میں روز افزوں ترقی کی متوازی روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس کی تنظیمِ نو بھی کرنا ہے

"تعلیم کا اصل مقصود یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان بنائے اور حقیقی انسانیت اس بات پر مشتمل ہے کہ دنیا کے لیے انسان کا وجود زینت کا باعث ہو۔ وہ دیانت داری اور صلح کاری کا پیکر ہو۔ اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہو یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرنے لگے جس کی جڑیں تو زمین میں پیوست ہیں لیکن اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں"۔(۳)

روحانیت و اخلاق

اقبال کے نزدیک تعلیم صرف دماغی تربیت نہیں بلکہ روحانی و اخلاقی تربیت بھی ہے۔ وہ ایسے نظام تعلیم کے خواہاں تھے جو انسان میں صداقت، شجاعت، ایثار، خدمت اور دیانت جیسے اوصاف پیدا کرے۔ اقبال کے نزدیک دنیا میں امن ہرگز قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ تعلیم کے ذریعے روحانی اور اخلاقی فوائد حاصل نہ کیے جائیں۔ اس حوالے سے اقبال کا پیغام یہ ہے کہ انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو محض اخلاقیات اور احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ اس وقت بہت سے ممالک ایک دوسرے کے ساتھ بلا وجہ صف آرا ہو رہے ہیں۔ ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم ہونے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹانے کے درپے ہیں۔ معاشرے کی موجودہ صورتِ حال کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ اس لیے اگر سوچا جائے تو وحدت صرف ایک ہی محترم ہے اور وہ ہے بنی نوع انسان کی وحدت۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ:

"رنگ نسل اور خون سے بالاتر ہے جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو مٹایا نہ جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے"۔(۴)

عملی زندگی سے ربط

علامہ اقبال ایسی تعلیم کے قائل تھے جو انسان کو

ست، مقلد اور بے عمل نہ بنائے بلکہ اسے تخلیقی و عملی میدانوں میں سرگرم رکھے۔ اقبال نے ایسی تعلیم پر زور دیا ہے کہ جس کا مقصد عملی زندگی میں دوسروں کے کام آنا ہو

> اقبال فرماتے ہیں کہ فرد کی حیثیت سے اس کی دماغی نجات و آزادی اور طبعی علوم کی غیر متناہی ترقی، ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس نے جدید زندگی کی اساس کو یکسر متغیر کر دیا ہے، چنانچہ جس قسم کا علم کلام اور علم دین مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کی تسکین قلب کے لیے کافی ہوتا تھا وہ آج تسکین بخش نہیں ہے

اور اس سے معاشرے کو مجموعی طور پر فوائد حاصل ہوں۔ فرد کا رابطہ اتحاد یعنی متحد ہونے کے ساتھ ہے نہ کہ جزو کے ساتھ۔ تعلیم کے ذریعے روایات مجتمع کے جو مختلف اجزا اس طور پر منتقل کیے جاتے ہیں وہ نفس ناطقہ قومی میں جذب اور پیوست ہو کر ان چند افراد یا قوم کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں جن کی پوری زندگی اور کل قابلیت غور و فکر قوم کے مختلف آیات اور مقاصد کی منزلیں طے کرنے میں گزر جاتی ہیں۔ اس مفہوم کو اگر دیکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم معاشرے کی محافظ ہے۔ اس کا مقصد فرد کو معاشرے کی ثقافتی اور عملی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اقبال کے بقول:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

تعلیم وہ نہیں جو صرف معلومات کا انبار ہو بلکہ وہ ہے جو شخصیت کو نکھارے اور انسان کو تخلیق کار بنائے۔

اقبال تعلیمی تخلیق سے ہمیشہ آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا اور اس طرح اس کی ذات کے اثبات، توسیع، تسلسل اور بقا کا سامان مہیا کرتا ہے۔ زندگی کے اس نمو پذیر اور محیط بالذات مرکز کو اقبال خودی کہتے ہیں۔ خودی کا اپنے آپ سے رشتہ علم و ادراک کا ہے جس سے اس پر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ ایک بامقصد ہستی ہے اور یہ کہ آرزو و عمل اس کی روح رواں ہیں۔ فطرت، خواہ وہ اس کی اپنی طبیعت ہو یا دنیائے آب و گل، اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، لیکن اسے مسخر کرنے ہی سے اس کی پنہاں قوتیں ظاہر ہوتی ہیں اور وہ استحکام اور ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ جس طرح فطرت کی تسخیر سے اس کی ذات کا اثبات ہوتا ہے اسی طرح خدا کے قرب سے وہ انفرادیت سے مالا مال ہوتی ہے۔ انسان ہنوز مکمل انفرادیت نہیں۔ اسے خدا سے جتنی قربت ہوتی ہے اتنی ہی اس کی اپنی انفرادیت ضعیف ہوتی ہے۔ جیسا کہ:

> ''جو شخص خدا سے زیادہ قریب ہے وہی سب سے زیادہ کامل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خدا میں جذب ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف وہ

> تعلیم کا اصل مقصود یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان بنائے اور حقیقی انسانیت اس بات پر مشتمل ہے کہ دنیا کے لیے انسان کا وجود زینت کا باعث ہو، وہ دیانتداری اور صلح کاری کا پیکر ہو۔ اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہو یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرنے لگے جس کی جڑیں تو زمین میں پیوست ہیں لیکن اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں

خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے''۔(۵)

خدا سے قرب کی قوت انسان کو عشق سے حاصل ہوتی ہے جس سے خودی منفرد اور مستحکم ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کے اجزاء منتشر، اس کی قوت زائل اور اس کا مرتبہ خدا سے دور ہونے کی وجہ سے کم ہوتا جاتا ہے۔ اقبال کی زندگی کا تیسرا دور ان کی فلسفیانہ فکر کا تخلیقی دور تھا، اسی طرح چوتھا دور ان کی دینی فکر کا تخلیقی دور ہے جس میں یہ سوال ان کی توجہ کا مرکز بنا کہ اسلام کے ابدی قانون میں حرکت کی روح کس طرح پھونکی جائے؟ اس سوال کے جواب میں بتایا گیا ہے کہ:

''زندگی کی اساس بلاشبہ روحانی اور ابدی ہے لیکن ابدی اصول ان کے نزدیک تغیر و تبدل کے امکانات کو بالکل ختم نہیں کر دیتے، کیونکہ تغیر قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے جسے نظر انداز کر کے ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے حرکت سے عاری کر دیں گے''۔(۶)

فقہی اصطلاح میں حرکت کے اس اصول کا نام اجتہاد ہے۔ چنانچہ فقہ اسلامی میں اجتہاد کے تصور پر انھوں نے ۱۹۲۲ء میں انگریزی میں ایک مقالہ لکھا اور حبیبیہ ہال میں پڑھا لیکن بعض حلقوں کی طرف سے اس پر سخت نکتہ چینی کی گئی، اس لیے انھوں نے ''اس وقت اسے شائع نہ کیا۔ بہرحال ان کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ برابر اس مسئلے کی تحقیق کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ فرد کی حیثیت سے اس کی دماغی نجات و آزادی اور طبعی علوم کی غیر متناہی ترقی، ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس نے جدید زندگی کی اساس کو یکسر متغیر کر دیا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا علم کلام اور علم دین مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کی تسکین قلب کے لیے کافی ہوتا تھا وہ آج تسکین بخش نہیں ہے۔ اس سے مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے تو فکر دینی کو از سر نو تعمیر کرنا قطعاً ضروری ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ:

''میرے نزدیک قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے۔ جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے، کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرح نو کے مقابلے میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آج ضرورت ہے کہ دماغی اور ذہنی کاوش کو ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے اور ایک نئی دینیات اور کلام کی تعمیر و تشکیل میں اسے بروئے کار لایا جائے''۔(۷)

اقبال کا تنقیدی زاویہ موجودہ نظامِ تعلیم پر کچھ اس طرح سے ہے کہ اقبال نے اس وقت کے استعماری نظامِ تعلیم پر کڑی تنقید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ موجودہ نظامِ تعلیم غیر مربوط، رٹا پر مبنی اور اخلاقیات سے دور ہوتا جا رہا ہے، اقبال کی تعلیمات ایک نئی روشنی کی مانند ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ ان کے فلسفے پر عمل کر کے ہم نہ صرف ایک

اقبال مغربی طرزِ تعلیم کو مادیت زدہ سمجھتے تھے اور اس کے مقابل ایک ایسا نظام تجویز کرتے تھے جو اسلامی اقدار، روحانی فکر اور تخلیقی عمل پر مبنی ہو

صرف غلام ذہن پیدا کر رہا ہے:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
جو چیز ہے تُو اس کا ہے اک اور ہی انداز

اقبال مغربی طرزِ تعلیم کو مادیت زدہ سمجھتے تھے اور اس کے مقابل ایک ایسا نظام تجویز کرتے تھے جو اسلامی اقدار، روحانی فکر اور تخلیقی عمل پر مبنی ہو۔

مثالی نظامِ تعلیم کے لیے اقبال کی تجاویز

اسلامی اقدار پر مبنی نصاب

اقبال تعلیم کو اسلامی فکر اور تہذیب سے مربوط دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مسلمان طالب علم کی تعلیم اس کی دینی شناخت اور روحانی ترقی کا ذریعہ ہونی چاہیے۔

اساتذہ کا اعلیٰ کردار

اقبال اساتذہ کو محض معلومات دینے والا فرد نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ اساتذہ کو مربی، رہنما اور قوم کے معمار سمجھتے تھے۔

طلبہ کی شخصیت سازی

ان کے خیال میں تعلیم کا مقصد طلبہ کو محض امتحانات کے لیے تیار کرنا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کی مکمل تعمیر ہے۔

تحقیق اور تخلیق کا فروغ

اقبال تحقیق، تخلیق اور جستجو کو تعلیم کا اہم جزو سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نوجوان سوال اٹھائیں، سوچیں، کھوج کریں اور نئی راہیں نکالیں۔

اقبال کی تعلیمات آج ہمارے لیے کیوں اہم؟

آج کے دور میں جب کہ ہمارا تعلیمی نظام بہتر تعلیمی نظام قائم کر سکتے ہیں بلکہ ایک مضبوط، باکردار اور خوددار قوم بھی تشکیل دے سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا تعلیم و تربیت کا تصور محض نظری نہیں بلکہ ایک مکمل عملی خاکہ ہے۔ ان کے افکار ہمیں بتاتے ہیں کہ تعلیم کا اصل مقصد فرد کو انسان بنانا، اس کے اندر خودی پیدا کرنا اور اسے معاشرے کا فعال رکن بنانا ہے۔ آج اگر ہم اپنے تعلیمی نظام کو اقبال کے نظریات کی روشنی میں استوار کریں تو نہ صرف تعلیمی زوال کا خاتمہ ممکن ہے بلکہ ایک نئی فکری و تہذیبی بیداری بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ الحدیث: القاصد الحسنۃ، ص: ۳۵۱

۲۔ سید عبدالواحد معینی (مرتب)، مقالاتِ اقبال، شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۴

۳۔ بختیار حسین صدیقی، اقبال بحیثیت مفکرِ تعلیم، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۵

۴۔ لطیف احمد شیروانی، مؤلف، حرف اقبال، لاہور، المنار اکیڈمی، ۱۹۴۷ء، ص ۲۴۶۔۲۴۷

۵۔ دیباچہ اسرار خودی، انگریزی ترجمہ از آر۔ای نکلسن بعنوان سیکریٹس آف دی سیاف، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۱۹

۶۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامی،، مترجم نذیر نیازی، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۲۲۷

۷۔ محمد حسین خان زبیری (مروت)، مشاہیر کے تعلیمی نظریے، جاوید پریس، کراچی، س۔ن، ص ۲۷۰۔۲۷۱

☆☆☆☆

مطبوعات ادارۂ فروغ قومی زبان

وسطِ ایشیا میں اُردو
ڈاکٹر رؤف امیر
قیمت:۔/۱۵۰

جہانِ اُردو
مرتبہ: عارف حسین
قیمت:۔/۶۰۰

شبلی نعمانی
(کتابیات)
ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ
قیمت:۔/۲۰۰

بابائے اردو مولوی عبدالحق
(احوال و آثار)
ڈاکٹر ارشد اویسی
قیمت:۔/۷۰۰

بچوں کی لغت
پروفیسر خلیق احمد صدیقی
قیمت:۔/۸۰۰

قانونی دستاویز نویسی
ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خان
قیمت:۔/۸۰۰

محاکمۂ مرکزِ اُردو
منشی سید احمد صاحب دہلوی
ڈاکٹر محمد ارشد اویسی
قیمت:۔/۱۵۰

ادارۂ فروغ قومی زبان کے ڈائریکٹر جنرل، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر مختلف کالجوں کے سربراہان کو ادارے کی طبع شدہ کتب بطور تحفہ پیش کرتے ہوئے

ادارۂ فروغِ قومی زبان نے ملکی تعلیمی اداروں کی لائبریریوں کو ادارے کی طبع شدہ کتب بطور تحفہ پیش کیں

اسلام آباد۔ادارۂ فروغ قومی زبان کے ڈائریکٹر جنرل، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے مختلف کالجوں کے سربراہان کو ایک تقریب میں مدعو کر کے ادارے کی طبع شدہ کتب بطور تحفہ پیش کیں۔اس موقع پر ۲۵ سے زائد سرکاری کالجوں کے خواتین و حضرات پرنسپلوں نے تقریب میں شامل ہو کر اپنے کالجوں کی لائبریریوں کے لیے کتب وصول کیں۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈائریکٹر جنرل ادارۂ فروغ قومی زبان نے کہا کہ ہمارے پاس بہت سی عمدہ کتب کا ذخیرہ موجود ہے جو ہم ملک بھر کے سرکاری تعلیمی اداروں کی لائبریریوں تک پہنچانا چاہتے ہیں تا کہ ہماری نئی نسل کی کتاب دوستی برقرار رہے اور وہ ان کتب کے ذریعے اردو زبان و ادب سے بھی آشنا ہوں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا تعلیمی نظام کئی ممالک کے تعلیمی نظام سے بہتر ہے اور اس میں مزید بہتری کے لیے ہمیں اجتماعی سطح پر کوششیں جاری رکھنی چاہئیں کیونکہ علم ایک ایسا خزانہ ہے جو بانٹنے سے بڑھتا ہے اور کوئی بھی علم زبان و ادب کی تعلیم کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ڈاکٹر راشد حمید، ایگزیکٹو ڈائریکٹر ادارۂ فروغِ قومی زبان نے کہا کہ کسی بھی معاشرے کی ترقی میں زبان و ادب خاص کردار ادا کرتے ہیں آج کی تقریب ہماری کتب کو سرکاری کالجوں کی لائبریریوں تک پہنچانے کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے نہ صرف جیسے مستقبل میں بھی جاری رکھا جائے گا بلکہ طلبہ کو آئندہ ہماری کتب ڈیجیٹل انداز میں بھی دستیاب ہوں گیں کیونکہ ہمارے ادارے کی نئی آنے والی کتب ہماری ویب سائٹ پر بھی موجود ہوں گی۔ ادارے کے ڈپٹی ڈائریکٹر محبوب خان بگٹی نے مختصراً ادارے کا تعارف پیش کیا۔آخر میں ہر کالج کو ادارے کی جانب سے ۲۸۰ کتب کا سیٹ پیش کیا گیا۔

> ڈائریکٹر جنرل پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے ادارۂ فروغِ قومی زبان میں عملی تربیت مکمل کرنے پر وفاقی اردو یونیورسٹی کے طلبہ میں اسناد تقسیم کیں

اسلام آباد۔وفاقی اُردو یونیورسٹی کے بی ایس اُردو پروگرام کے طلبہ و طالبات نے ادارۂ فروغِ قومی زبان اسلام آباد میں چھ ہفتوں پر مشتمل عملی تربیت کامیابی سے مکمل کر لی۔ تربیت مکمل کرنے پر ڈائریکٹر جنرل، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے طلبہ و طالبات میں اسناد تقسیم کیں اور وفاقی اُردو یونیورسٹی کے اساتذۂ کرام کو کتب تحفتاً پیش کیں۔اس موقع پر ایک پُر وقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔تقریب میں ڈاکٹر راشد حمید، ایگزیکٹو ڈائریکٹر، ڈاکٹر فہمیدہ تبسم، ڈاکٹر ناہید قمر، ڈاکٹر زینت افشاں، محبوب خان بگٹی، کامران مشتاق، ڈاکٹر عارف حسین اور نثار محمد نے بھی شرکت کی۔ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے اپنے خطاب میں کہا کہ عملی تربیت نوجوان طلبہ کی زندگی میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔سیکھنے کا عمل زندگی بھر جاری رہتا ہے اور اس نوعیت کے تربیتی پروگرام نوجوانوں کی علمی و فکری نشوونما میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔انھوں نے مزید کہا کہ ادارۂ فروغِ قومی زبان اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہے۔ادارۂ فروغِ قومی زبان کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر ڈاکٹر راشد حمید نے کہا کہ علمی تربیت نوجوان نسل کو باشعور، باکردار اور علم دوست بنانے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ ادارۂ فروغِ قومی زبان ہمیشہ یہ کوشش کرتا رہے گا کہ طلبہ کو معیاری اور قومی زبان میں اعلیٰ تربیت فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہا ہے۔آخر میں طلبہ و طالبات نے ادارۂ فروغِ قومی زبان کے تمام منتظمین، اساتذہ اور تربیت فراہم کرنے والے ماہرین کا شکریہ ادا کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ مستقبل میں بھی ایسے مفید تربیتی پروگرام جاری رکھے جائیں۔

☆☆☆☆

ادارۂ فروغِ قومی زبان کے ڈائریکٹر جنرل، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر وفاقی اُردو یونیورسٹی کے بی ایس اُردو پروگرام کے طلبہ و طالبات کو عملی تربیت مکمل ہونے پر اسناد تقسیم کرتے اور ادارے کی کتب پیش کرتے ہوئے

ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد میں ادبی وثقافتی تنظیم دبستانِ پوٹھوہار، اسلام آباد کے تعاون سے معروف شاعرہ صائرہ زیدی کے اعزاز میں شعری نشست کے موقع پر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، جلیم قریشی، ڈاکٹر وحید احمد اور ڈاکٹر مہناز انجم ودیگر شعراء

زبان، تہذیب اور ادب کا فروغ ہماری اصل شناخت ہے۔ صدرِ محفل جلیم قریشی

ایسی تقریبات نئی نسل کو تہذیب سے جوڑتی ہیں جو ہمارے لیے قابلِ فخر ہے۔ محمد سلیم مظہر

اسلام آباد۔ ادبی وثقافتی تنظیم دبستانِ پوٹھوہار، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام اور ادارۂ فروغِ قومی زبان کے تعاون سے معروف شاعرہ صائرہ زیدی کے اعزاز میں ایک باوقار شعری نشست منعقد کی گئی۔ یہ ادبی محفل ادارۂ فروغِ قومی زبان کے ہال میں منعقد ہوئی، جس میں مختلف شعراء نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت معروف ادبی شخصیت وشاعر جلیم قریشی نے کی جبکہ ڈاکٹر وحید احمد اور ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد مہمانانِ خصوصی تھے۔ صائرہ زیدی کی بہن نغمہ صبوحی نے بطور خاص اس پروگرام میں شرکت کی اور سیکریٹری دبستانِ پوٹھوہار، فرزند علی ہاشمی اور ڈاکٹر مہناز انجم نے تقریب کی نظامت کے فرائض ادا کیے۔ مشاعرے میں معروف اور نئے شعرا نے اپنا کلام پیش کیا، جنھیں سامعین کی جانب سے خوب داد وتحسین ملی۔ صائرہ زیدی نے اپنی تازہ تخلیقات پیش کیں، جو سننے والوں کے دلوں کو چھو گئیں اور محفل کو ایک یادگار بنا دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ڈائریکٹر جنرل ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، نے اس ادبی مجلس کے حوالے سے کہا کہ ''ادب و ثقافت ہماری پہچان ہے اور ایسی تقریبات نئی نسل کو اپنی زبان وتہذیب سے جوڑنے کا ذریعہ ہیں۔'' صدرِ محفل جلیم قریشی نے اس ادبی و ثقافتی مشاعرے کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''ایسے مشاعرے محض شعری محفلیں نہیں بلکہ زبان، تہذیب اور فکری روایات کے تسلسل کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ان سے نہ صرف نئی نسل کی تخلیقی تربیت ممکن ہوتی ہے بلکہ قومی زبان کے فروغ میں بھی مؤثر کردار ادا کیا جا سکتا ہے۔'' مہمانانِ خاص نے اس نشست کو ایک کامیاب، بامقصد اور بامعنی ادبی سرگرمی قرار دیا۔ کلام سنانے والے شعرا میں فرزند علی ہاشمی، ڈاکٹر مہناز انجم، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، جلیم قریشی، ڈاکٹر وحید احمد، جنید آذر، نغمہ صبوحی، فرح دیبا، ڈاکٹر اسد منیر، حسیب جمال، ساجد قریشی، ڈاکٹر منیر فیاض، شاذیہ اکبر، ڈاکٹر مظہر عباس رضوی، مومنہ وحید، اقبال طارق، علی شعار بنگش اور فاخرہ نورین ودیگر شامل تھے۔

کہانی لکھنا نوجوانوں کے لیے ایک شعوری، تخلیقی اور تخلیقی عمل ہے خالد فتح محمد

اسلام آباد۔ ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد میں احمد سلیم اسٹڈی سرکل کے زیرِ اہتمام ایک روزہ سیمینار بعنوان ''کہانی کیسے لکھیں'' کا انعقاد کیا گیا۔ یہ ادبی و فکری نشست معروف محقق، مترجم اور دانشور احمد سلیم کی علمی و فکری خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے اور ان کی فکر کو نئی نسل تک پہنچانے کے مقصد سے منعقد کی گئی۔ ڈائریکٹر جنرل ادارۂ فروغِ قومی زبان، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اپنے خطاب میں انھوں نے احمد سلیم کی فکری جہتوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ احمد سلیم کا تحقیقی و فکری سرمایہ ہمارے علمی ورثے کا اہم حصہ ہے۔ انھوں نے زور دیا کہ نوجوان نسل کو اقبال کی فکر اور احمد سلیم جیسے فکری رہنماؤں کے نظریات سے جوڑنا وقت کی ضرورت ہے۔ سیمینار میں احمد سلیم اسٹڈی سرکل کے قیام کے اغراض ومقاصد پر بھی روشنی ڈالی گئی، جس کا مقصد احمد سلیم کی فکری روایت کو فروغ دینا اور نئی نسل کو تحقیق، ادب اور شعور سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ تقریب کی ترتیب کاری نامور ناول نگار خالد فتح محمد نے کی، جب کہ انتظامی ٹیم میں ڈاکٹر غزل یعقوب، ڈاکٹر امجد کلو، ڈاکٹر حمیرا اشفاق اور محترمہ انمول فاطمہ شامل تھیں۔ پروگرام کے دوسرے حصے میں نامور ناول نگار خالد فتح محمد نے نوجوان لکھنے والوں کے لیے ایک تربیتی نشست سے خطاب کیا، جس میں کہانی نویسی کے فنی وتکنیکی پہلوؤں جیسے تخلیقی عمل، کردار نگاری، مکالمہ نویسی اور ادبی اظہار پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ نشست کے دوران مختلف جامعات سے تعلق رکھنے والی طالبات نے کہانی نویسی کے حوالے سے سوالات کیے، جن کے خالد فتح محمد نے نہایت بصیرت افروز اور رہنمائی پر مبنی جوابات دیے۔ انھوں نے لکھنے کے عمل کو ایک مستقل مزاجی، مشاہدے اور گہرے مطالعے کا نتیجہ قرار دیا۔ اس موقع پر دو نوجوان طالبات آمنہ نیر اور انمول فاطمہ نے اپنے افسانے پیش کیے، جن پر حاضرین نے تنقیدی تبصرے کیے اور تخلیقی بہتری کے لیے تجاویز بھی پیش کیں۔ تقریب کے اختتام پر پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر اور خالد فتح محمد نے سیمینار کے شرکاء میں اسناد تقسیم کیے گئے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے اپنے اختتامی کلمات میں ایسے مطالعاتی حلقوں کی اہمیت پر زور دیا اور ڈاکٹر حمیرا اشفاق ودیگر منتظمین کو ان کی کوششوں پر خراجِ تحسین پیش کیا۔

☆☆☆☆

ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد میں احمد سلیم اسٹڈی سرکل کے زیرِ اہتمام ایک روزہ سیمینار بعنوان ''کہانی کیسے لکھیں'' کے موقع پر ڈاکٹر حمیرا اشفاق، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، خالد فتح محمد اور دیگر شرکاء

وفاقی وزیر برائے قومی ورثہ وثقافت ڈویژن جناب اورنگزیب کھچی اور سیکریٹری قومی ورثہ وثقافت ڈویژن جناب اسد رحمان گیلانی، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر اور ڈاکٹر راشد حمید اردو ولغت بورڈ کراچی (فیلڈ دفتر ادارہ فروغ قومی زبان) کا دورہ کے موقع پر

اداروں کو استحکام دینا ہمارا مشن ہے، اپنے ثقافتی ورثے اور زبانوں کی حفاظت و ترویج ہماری قومی ذمہ داری ہے جسے ہم بھرپور انداز میں ادا کریں گے۔ وفاقی وزیر اورنگزیب خان کھچی
اردو کی وسیع پیمانے پر ترویج و اشاعت کے لیے تمام دستیاب ذرائع کا بھرپور استعمال کیا جائے، وفاقی سیکریٹری اسد رحمان گیلانی

کراچی۔ وفاقی وزیر برائے قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن جناب اورنگزیب کھچی اور سیکریٹری قومی ورثہ وثقافت ڈویژن جناب اسد رحمان گیلانی نے اردو لغت بورڈ کراچی (فیلڈ دفتر ادارہ فروغ قومی زبان) کا دورہ کیا۔ اس موقع پر سینئر جوائنٹ سیکریٹری سینو سکندر جلال بھی ہمراہ تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر ڈائریکٹر جنرل ادارہ فروغ قومی زبان نے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے ہمراہ مہمانوں کا استقبال کیا اور گلدستے پیش کیے اور پودے لگائے۔ اس موقع پر ایگزیکٹیو ڈائریکٹر ادارہ فروغ قومی زبان ڈاکٹر راشد حمید، ڈپٹی ڈائریکٹر محبوب بگٹی، افسر حسابات اردو لغت بورڈ وصی اللہ خان، یوسف علی، غلام قادر کلادی و دیگر اراکین ادارہ بھی موجود تھے۔ ادارے کی کارکردگی اور پریزینٹیشن کے بعد وفاقی وزیر برائے قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن جناب اورنگزیب کھچی نے کہا کہ اداروں کو استحکام بخشنا موجودہ حکومت کی اولین ترجیح ہے، اردو لغت بورڈ کی خالی اسامیوں پر جلد بھرتی کی جائے گی۔ وزیر محترم نے ادارے کے لیے حکومتی سطح پر ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کروائی۔ وفاقی سیکریٹری برائے قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن جناب اسد رحمان گیلانی نے گفتگو میں اس بات پر زور دیا کہ اردو کی وسیع پیمانے پر ترویج و اشاعت کے لیے تمام دستیاب ذرائع کا بھرپور استعمال کیا جائے۔ اجلاس کے اختتام پر ڈائریکٹر جنرل ادارہ فروغ قومی زبان نے جملہ مہمانان گرامی کا شکریہ ادا کیا اور اردو لغت بورڈ کی شائع کردہ مختصر اردو لغت کا دو جلدوں پر مشتمل سیٹ اور اردو لغت نستعلیق اشاعت کی جلد اول وزیر محترم اور سیکریٹری صاحب کی خدمت میں پیش کیں۔

کامیاب مشاعرے قومی زبان کے فروغ میں اہلِ قلم کا ایک مثبت قدم ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر

اسلام آباد۔ ادبی و ثقافتی تنظیم زاویہ اور احمد فراز ٹرسٹ، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام، ادارۂ فروغ قومی زبان کے تعاون سے امریکہ میں مقیم اردو کے معروف شاعر صحافی اور دانش ور راشد نور کے اعزاز میں شام ملاقات اور مشاعرے کی نشست کا انعقاد ہوا۔ یہ ادبی محفل ادارۂ فروغ قومی زبان کے ہال میں منعقد ہوئی، جس میں ملک کے مختلف شہروں سے شعرا و ادیبوں نے شرکت کی۔ نشست کی صدارت معروف ادبی شخصیت جناب حلیم قریشی نے کی، جبکہ ڈائریکٹر جنرل پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر اور ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد مہمانانِ خصوصی تھے۔ محترمہ افشاں عباسی نے مہمانِ اعزاز کے طور پر شرکت کی۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض محبوب ظفر نے انجام دیے۔ سعدی فراز نے فراز ٹرسٹ کی جانب سے راشد نور کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں شیلڈ پیش کی اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مشاعرے میں معروف اور نو آموز شعرا نے اپنا کلام پیش کیا، جنھیں سامعین کی جانب سے خوب داد و تحسین ملی۔ کلام سنانے والے شعرا میں حلیم قریشی، سید طاہر، وفا چشتی، محبوب ظفر، سلمان باسط، طالب انصاری، انجم سلیمی، عبدالقادر تاباں، ارشد محمود ناشاد، رحمان حفیظ، شمشیر حیدر، عرفان جمیل، خورشید انجم، درشہوار، افشاں عباسی، ناصر عقیل، مدیحہ ارسلان، عقیل شاہ، شاہد زمان، اختر رضا سلیمی، شاہد اقبال، روشی ملک، روبینہ شاد، اعظم نصرت، مہناز انجمن، عمیر علی انجم اور جمال زیدی شامل تھے۔ جناب راشد نور نے اپنی تازہ تخلیقات پیش کیں، جو سننے والوں کے دلوں کو چھو گئیں اور محفل کو ایک یادگار ادبی لمحہ بنا دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ڈائریکٹر جنرل ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، نے اس ادبی مجلس کے حوالے سے کہا کہ ''ادب و ثقافت ہماری پہچان ہے اور ایسی تقریبات نئی نسل کو اپنی زبان و تہذیب سے جوڑنے کا ذریعہ ہیں''۔ مہمانان نے اس نشست کو ایک کامیاب، بامقصد اور بامعنی ادبی سرگرمی قرار دیا، جو نہ صرف قومی زبان کے فروغ بلکہ اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک مثبت قدم ہے۔

☆☆☆☆

ادبی و ثقافتی تنظیم زاویہ، احمد فراز ٹرسٹ، اسلام آباد اور ادارہ فروغ قومی زبان کے تعاون سے امریکہ میں مقیم اردو کے معروف شاعر صحافی اور دانش ور راشد نور کے اعزاز میں شام ملاقات اور مشاعرے میں شامل شعراء

ادبی وثقافتی تنظیم ''زاویہ'' کے زیرِاہتمام ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد میں معروف شاعرہ رخشندہ نوید کے نئے شعری مجموعے ''رات مجھے اچھی لگتی ہے'' کی تقریب رونمائی و پذیرائی کے موقع پر محبوب ظفر، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، افتخار عارف، پروفیسر جلیل عالی، رخشندہ نوید اور ڈاکٹر وحید احمد

ہر شاعر ایک ہی طرح کا شعر نہیں کہہ سکتا نہ ہی ایک شاعر ہر طرح کا شعر کہہ سکتا۔ افتخار عارف
رخشندہ عام زندگی کے مسائل کو شعریت میں ڈھالنے کا ہنر جانتی ہے۔ پروفیسر جلیل عالی

اسلام آباد۔ ادبی وثقافتی تنظیم ''زاویہ'' کے زیرِاہتمام ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد میں اُردو اور پنجابی کی معروف شاعرہ رخشندہ نوید کے نئے شعری مجموعے ''رات مجھے اچھی لگتی ہے'' کی تقریب رونمائی اور پذیرائی منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت نامور شاعر افتخار عارف نے کی۔ ممتاز شاعر پروفیسر جلیل عالی اور ڈائریکٹر جنرل ادارۂ فروغِ قومی زبان پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر مہمانانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر وحید احمد، پروین طاہر اور ڈاکٹر حمیرا اشفاق کلیدی مقرر تھے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض محبوب ظفر نے ادا کیے۔ افتخار عارف نے کہا کہ ہر شاعر ایک ہی طرح کا شعر نہیں کہہ سکتا نہ ہی ہر طرح کا شعر کہتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سہولت سے شعر کہنا بظاہر آسان لگتا ہے مگر ایسا ہے نہیں۔ رخشندہ نے اس کتاب میں بے ساختگی اور پختگی کو قائم رکھا۔ ممتاز شاعر جلیل عالی نے کہا کہ رخشندہ شوقیہ نہیں بلکہ باقاعدہ شاعرہ ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی شاعری کو دے دی۔ رخشندہ نے دل کی آواز کو شاعری کا رنگ دیا۔ ان کے ہاں زندگی کی کُلیّت موجود ہے۔ ان کو عام زندگی کے مسائل کو شعریت میں ڈالنے کا ہنر آتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے مہمانانِ گرامی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا رخشندہ فنا فی الشعر ہو چکی ہیں۔ مجھے ان کی شاعرانہ سادگی اور عاجزی میں صوفیانہ پن نظر آتا ہے۔ اختصار سے مگر کامیاب بات بلاغت سے بات مکمل کر لینا بہت مشکل کام ہے کہ جو کہ ایک منفرد انداز ہے۔ رخشندہ نے دو لفظوں کے مصرعے کہے ہیں جو بہت انوکھا مگر کامیاب تجربہ ہے۔ ڈاکٹر وحید احمد نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ رخشندہ متنوع جہات پر لکھتی ہیں۔ انھوں نے بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا۔ رخشندہ مشکل باتیں بہت آسان الفاظ میں سمجھا دیتی ہیں۔ اُس نے خزاں کو بھی مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ پروین طاہر ذاتی مصروفیات کی بنا پر تقریب میں شرکت نہ کر سکیں مگر انھوں نے اپنا عمدہ مضمون لکھ کر بھیجا جسے محبوب ظفر نے پڑھ کر سنایا۔ اُن کے مطابق رخشندہ نوید ایک بہترین شاعرہ ہیں۔ ان کے ہاں سادہ اور مشکل قافیے اور متنوع اوزان ملیں گے جو اُن کی تخلیقی پختگی کا ثبوت ہیں۔ خدا اُن کے تخلیقی وجود کو زندہ رکھے۔ رخشندہ کی شاعری میں محبوب کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ ناول نگار، افسانہ نگار اور محقق ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے تقریب سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ رخشندہ کی شاعری پڑھتے ہوئے مکالمے کی صورت بنتی جاتی تھی۔ نہایت مختصر بحروں کا استعمال کیا ہے جو حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ان کی شاعری خود نوشت لگتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اُن کو جتنا پڑھا مزید پڑھنے کی خواہش جاگی۔ صاحبِ کتاب رخشندہ نوید نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی زندگی کے سفر کو سراپا شاعری کہہ سکتی ہوں کیونکہ گیارہ سال کی عمر سے شاعری ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ دنیا سے فرار میں شاعری میرا سہارا ہے جو مجھے مصیبتوں سے تحفظ کا احساس دلاتی ہے۔ میرے خیال میں کوئی بھی اچانک شاعر نہیں بنتا بلکہ پیدائشی طور ہوتا ہے۔ آخر میں شاعرہ نے اپنے تازہ مجموعے میں سے چند اشعار سنائے اور خوب داد پائی۔

ادب، تعلیم اور جدید ذرائع ابلاغ میں اُردو کا فروغ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ڈاکٹر راشد حمید

اسلام آباد۔ یونیورسٹی آف جھنگ کے شعبہ اُردو کے طلبہ و طالبات نے ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد کا مطالعاتی دورہ کیا۔ اس موقع پر ادارے کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر، ڈاکٹر راشد حمید نے اُردو زبان کی ترویج و ترقی پر تفصیلی گفتگو کی۔ اُنھوں نے کہا کہ اُردو ہماری تہذیب اور قومی وحدت کی علامت ہے، اس کی ترویج ہر پاکستانی کی ذمہ داری ہے۔ ادارے کے ڈپٹی ڈائریکٹر، محبوب بگٹی نے ادارے کے مختلف شعبہ جات، اہداف، اور اب تک کی کامیابیوں تحقیقی اور تربیتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ اس مطالعاتی دورے میں یونیورسٹی کے اساتذہ کرا پروفیسر ڈاکٹر مجاہد عباس، پروفیسر ڈاکٹر زاہدہ فاظل، ڈاکٹر عدنان احمد، قمر عباس علوی، عطاء الرحمٰن عطا، ڈاکٹر سندس حنیف اور دیگر موجود تھے۔ اساتذہ اور طلبہ و طالبات نے ادارۂ فروغِ قومی زبان کی میزبانی اور علمی خدمات کو سراہا۔ اُنھوں نے کہا کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر کی قیادت میں ادارہ ایک روشن مثال بن چکا ہے، اور اُردو کے فروغ کے لیے شاندار کردار ادا کر رہا ہے۔ طلبہ و طالبات نے اس دورے کو اپنی علمی زندگی کا یادگار لمحہ قرار دیا۔ دورے کے اختتام پر طلبہ و طالبات نے ادارے کے مختلف شعبوں جیسے لائبریری، کتاب گھر اور اخبارِ اردو کا دورہ کیا۔

☆☆☆☆

یونیورسٹی آف جھنگ کے شعبہ اُردو کے طلبہ وطالبات کا ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد کا مطالعاتی دورہ

ڈاکٹر ابرار خٹک، اکوڑہ خٹک

اُردو اِملا کے نظری اصول ومباحث کی تاریخی روایت

اس مضمون میں اردو املا سے متعلق اہم مباحث، جیسے: نظری، اصلاحی روایت، بنیادی مسائل، علمائے املا کی جانب سے مجوزہ حل، اردو کا املائی نظام، تلفظ اور صوتیات کے مسائل، اردو کی آوازیں، حرف وصوت کے رشتے، متشابہ الصوت حروف، عربی کے الفاظ واعلام، اعرابی نظام، سکونِ اول کے مسائل؛ اور اردو میں انگریزی، ترکی، جاپانی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اور ان سے جڑے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان مباحث کی نوعیت علمی ہے، اس لیے اہم ترین نکات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر موضوع کے اختتام پر مباحث کی روشنی میں غیر حتمی یا مجوزہ رائے دینے کی سعی کی گئی ہے۔

اُردو اِملا کے مسائل ومباحث

اردو املا کے مسائل کے حوالے سے ماہرینِ املا کے نقطہ ہائے نظر کا مختلف ہونا فطری امر ہے۔ اختلاف و اتفاق کے مختلف رنگ ہر دور میں سامنے آتے رہے ہیں، تاہم اس موضوع کا تعمیری پہلو یہ ہے کہ مختلف اوقات میں تنقیدی و تفہیمی مباحث کے نتیجے میں انتہائی وقیع اور فکر انگیز علمی نکات سامنے آئے ہیں جن کی بنیاد پر یکسانیت، معیار اور تعینِ اِملا کی راہیں کافی حد تک ہموار ہوتی رہی ہیں۔ ماہرینِ اِملا نے املا کی مختلف جہتوں، پہلوؤں پر تبادلہ ہائے خیالات کے ذریعے اردو ادب ولسانیات کا دامن تاریخی لحاظ سے علمی وفنی سرمایے سے بھر دیا ہے؛ اس طرح ان مباحث کے ذریعے اردو املا اور رسم الخط کو اہم ''اثاثہ'' بھی ملا ہے۔ یہ مباحث جہاں اردو زبان وادب کے دامن میں ''گراں بہا دولت'' کی مانند ہیں وہاں اس کے ذریعے طالبانِ زبان وادب کی فکری وفنی آبیاری اور تربیت کی بہت بڑی کمی بھی پوری ہو سکتی ہے۔ ان مباحث کا تحقیقی، تنقیدی اور توضیحی مطالعہ فکر انگیز نکات کی تفہیم اور اشاعت کا سبب بن سکتا ہے جس کا براہِ راست نتیجہ جہاں املا کے اہم مسائل ومباحث کو مطالعے کے لیے عام کرنے کی صورت میں نکلے گا وہاں املا کے حوالے سے ان صدف ریزوں کے ذریعے یکسانیت کے بہت سارے نکات بھی منکشف ہوں گے اور ہم ان شاء اللہ اختلاف میں اتحاد کی جانب قدم بڑھا سکیں گے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی یہ بات درست ہے کہ بلاشبہ املا کے قاعدے کیسے ہی ہمہ گیر بنائے جائیں، زبان کی پوری اور سچی ترجمانی ان سے مشکل سے ہو سکے گی[۱] کیونکہ دنیا کا ہر رسم الخط زبان کی 'ہو بہ 'ہو ترجمانی سے قاصر نظر آتا ہے۔ ہر زبان میں رنگا رنگ لہجے اور طرح طرح کے تلفظ ہیں، جب کہ علامات محض معمول کے تلفظ اور اوسط درجے کی آوازوں کو ہی ضبطِ تحریر میں لا سکتی ہیں، اور لہجے میں ہر طرح کے اختلافات کو ظاہر کرنے کے لیے تحریری علامتیں وضع نہیں کی جا سکتیں۔[۲]

حرف وصوت کی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کی کما حقہٗ ترجمانی کا مسئلہ دنیا کی ہر زبان میں ایک پیچیدہ مسئلے کی صورت چلا آ رہا ہے؛ اردو کو بھی اس کا لامحالہ سامنا ہے۔ اردو کا املائی نظام اُردو زبان کے اخاذ اور اثر پذیر طبیعت کی طرح ہمہ جہت آوازوں، حروف اور علامات سے عبارت ہے۔ ماہرینِ اِملا نے وقتاً فوقتاً اس کی خوبیوں اور خامیوں کو خصوصی توجہ کا مرکز بنایا اور ''اصلاح وتعین'' کے ممکنہ امکانات کی طرف عوام وخواص کی توجہ مبذول کرانے کی کوششیں کی ہیں۔ اگرچہ اردو املا کے حوالے سے ماہرین میں شدید ترین اختلافات کا رجحان نہیں رہا تاہم مختلف نقطہ ہائے نظر، مکاتب ہائے فکر کا وجود بہر حال موجود ہے اور گاہے بہ گاہے اس موضوع پر اظہار ہائے خیالات کا تعمیری پہلو ''فکر انگیز'' نکات کی صورت سامنے آتا رہا ہے، جو اذہان وقلوب کو برانگیختہ کر کے اصلاحِ احوال کی درستی یا اس کے سمت کا تعین کرنے کے حوالے سے ہماری رہنمائی کا موجب بن جاتا ہے۔

اُردو میں اصلاحِ املا کی روایت

اُردو میں اصلاحِ املا کی روایت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہرینِ اِملا کے ہاں نظری مباحث کا رنگ بھی غالب رہا اور عملی طریقۂ کار کے اختلافی، قابلِ عمل اور متاثر کُن رجحانات بھی سامنے آئے ہیں۔ املا کے مسائل ومباحث اور اصلاح کے حوالے سے ابتدائی ادوار میں انفرادی کوششوں کا رجحان پورے شدومد کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

عالمگیر کے فرمان ''جن الفاظ کی اصل عربی وفارسی نہیں وہ اردو میں ہائے مختفی کی بجائے الف سے لکھے جائیں۔''[۳] کو اردو املا کے حوالے سے باضابطہ اصلاح کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔

ابو محمد سحر کا خیال تھا کہ بیسویں صدی سے قبل اردو املا کی اصلاح کی ایسی کوششیں نہیں ملتیں جو صحتِ زبان اور تصحیحِ لغت کے سلسلے میں ملتی ہیں۔[۴] جب کہ شازیہ آفتاب نے بھی اس سے ملتی جلتی رائے کا اظہار کیا تھا کہ بیسویں صدی سے قبل اردو املا پر کوئی مقالہ یا کتاب نہیں ملتی۔[۵]

تاہم ان دونوں کی یہ رائے درست نہیں۔ اردو کی قدیم لغات، قواعد اور دیگر کتب میں املا کے حوالے سے اہم نکات ملتے ہیں۔ اردو املا کے ارتقا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ موضوع انفرادی سطح پر دلچسپی کا حامل ضرور رہا ہے جیسے ظہور الدین حاتم اور تلامذۂ ناسخ[۶] کی اصلاح زبان واملا کی کوششیں؛ البتہ اجتماعی لحاظ سے دبستانی سطح پر اصلاح کی کوششیں عدم دلچسپی کا شکار نظر آتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج[۷] نے کتب کی اشاعت وطباعت کے لیے املا کا اپنا معیار مقرر کیا تھا اور بقول رشید حسن خاں ''سب رس'' میں اس کی بھرپور پیروی ملتی ہے۔[۸]

جہاں تک بیسویں صدی سے قبل اصلاح کی کوششوں کا تعلق ہے، غالب کے بعد دیبی پرشاد، مولوی نذیر احمد، امیر مینائی اور دیگر کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ عالمگیر سے لے کر غالب کی اصلاحاتِ املا اور بعد ازاں ''معیار الاملا'' از دیبی پرشاد ۱۸۶۷ء[۹]، ''رسم الخط یعنی قواعدِ اِملا وانشائے خط'' از مولوی نذیر احمد، ۱۸۷۷ء[۱۰] اور ''امیر اللغات'' از امیر مینائی[۱۱] کا سفر اردو املا کی اصلاحی کوششوں کا تسلسل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ امیر مینائی کا خط بنام آہ، اہمیت کا حامل ہے:

> ''الغرض املا کے اعتبار سے امیر اللغات مطلق قابلِ التفات نہیں، ملامت نامۂ جنگی لکھ بھیجا ہے مگر کیا ہوتا ہے۔''[۱۲]

اداروں کی سطح پر املا کو اہمیت بہت بعد میں حاصل ہوئی۔ املا کی اصلاح کو شعوری لحاظ سے موضوعِ بحث بنانے، نظری وعملی مباحث کا آغاز کرنے اور یکسانیت اور یک رنگی پیدا کرنے کے حوالے سے مولانا احسن مارہروی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۵ء کے فصیح الملک میں مولانا احسن ماہروی کی تجاویز[۱۳] کو نظری اور عملی دونوں حوالوں سے اہمیت حاصل

رہی ہے۔اردو املا کی اصلاح کے حوالے سے رومن، دیوناگری رسم الخط اور ٹائپ کے مسائل پر لکھنے اور اسے عام کرنے سے بھی اس کی طرف خصوصی توجہ دینے اور مباحث کا آغاز ہوتا ہے۔مرزا جافر حسن (جعفر حسن) نے آسان رسم الخط ۱۹۴۰ء میں لکھی[۱۴] جس میں انھوں نے کئی حروفِ تہجی کو خارج کر دیا تھا۔اداروں اور انجمنوں جیسے، انجمن ترقیِ اُردو ہند[۱۵]، دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام[۱۶]، محکمۂ تعلیم پنجاب [۱۷]، مکتبہ فرینکل [۱۸]، ترقی اُردو بورڈ[۱۹] اور مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد[۲۰] وغیرہ جیسے اداروں کے قیام کے نتیجے میں تعمیری روایت، سفارشات اور عملی طریق کار کا آغاز اداروں اور انجمنوں کی صورت میں سامنے آتا رہا، جس کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی جاری وساری ہے۔اس کے نتیجے میں ٹھوس اور قابلِ عمل تجاویز اور طریقہ ہائے کار کے، جہانات نے جنم لیا ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۳ء، اصلاحِ رسم الخط کمیٹی کا قیام اہم فیصلہ تھا۔۲۲ فروری ۱۹۴۳ء کو ابتدائی تجاویز پر غور ہوا۔اس کمیٹی کے ممبران مولوی عبدالحق، سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، برج موہن دتاتریہ کیفی اور وہاج الدین بستوری تھے۔کمیٹی کی تجاویز ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے مرتب کیں اور ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء ''ہماری زبان'' میں شائع ہوئیں جب کہ ۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء بکل ہند اردو کانفرنس ناگپور کی مجلس رسم خط نے یہ منظور کیں اور جنوری ۱۹۴۴ء کو'' اردو'' میں شائع ہوئیں۔[۲۱] تاہم ان تجاویز کے متعلق ایک رائے یہ بھی سامنے آئی ہے کہ''اس کی تہہ میں اس زمانے کے خیالات کے مطابق ٹائپ کے لیے آسانیاں فراہم کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔''[۲۲] جیسے لکھنا، کو لکھ نا، لکھتے کو لکھ تے، پھانس کو پھاں س، بہن کو بِ ہن وغیرہ، جبکہ بالکل کو بلکل، خوش کو خُش اور ث، س، ص، میں سے ص کو اور ذ، ز، ض، اور ظ میں سے ذ اور ض کو خارج کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔[۲۳]

ان سفارشات کے متعلق آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''ان اصلاحات کی خوبی یہ تھی کہ ان میں چلن، استعمال، آواز اور تلفظ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آج کی تدریسی اور طباعتی ضروریات کے لیے گنجائش نکالی گئی تھی، ان پر عمل بھی ہوا، ایک زمانے میں رسالہ ''اردو'' میں اس کا لحاظ بھی رکھا گیا مگر آئے دن کی ضروریات، کاتبوں کی عادات اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے ان پر پورا عمل نہ ہو سکا۔''[۲۴]

ڈاکٹر ابومحمد سحر کے مطابق اکثر اصلاحات کو قبولِ عام کی سند حاصل نہ ہو سکی، اصلاحات کی نوعیت اور ان پر عمل درآمد کے طریقے کی وجہ سے لوگوں کو اصلاحِ رسم الخط کمیٹی کی نمائندہ حیثیت پر بھی شک ہوا اور انجمن ترقیِ اُردو ہند کی کارگزاری ایک اختلافی مسئلہ بن گئی۔[۲۵]

ان کا خیال تھا کہ تقسیم ملک نے ہندوستان میں اردو کی بقا کا مسئلہ پیدا کر دیا کہ ہندی وہاں کی اور اردو پاکستان کی قومی زبان بنی۔ یاد رہے کہ ۱۹۴۰ء میں، مولوی احمد علی ناظر تعلیمات کی تجویز پر ہندی کی ماتراؤں کی تقلید میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے کئی علامتیں اختیار کیں اور بعد میں ۱۹۲۶ء و مابعد یہی کام عبدالغفار مدہولی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شروع کیا۔اردو املا میں ترمیم وتنسیخ کرنے کا بیڑا ۱۹۶۵ء میں مکتبہ جامعہ ملیہ، نئی دہلی نے اُٹھایا، جس کی مالی معاونت حکومتِ جموں وکشمیر نے کی، یہ کام (معیاری ادب کے تحت کتابوں کی اشاعت جن میں بڑی دور اس اصلاحات کر دی گئی تھیں) رشید حسن خان کی نگرانی میں ہوا۔ان کتابوں کی نمایاں خصوصیات درج ذیل تھیں:

مرکبات کو الگ لکھنا، متعدد الفاظ کے مروّجہ املا میں رد وبدل، ہندی یا اردو الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی کے بجائے (الف لانا، الفاظ کے آخر کی ہائے ملفوظ متصل میں شوشہ لگانا، اضافت کی صورت میں یائے مجہول ومعروف پر ہمزہ لگانا اور موزاوقاف واعراب کی افراط وغیرہ)۔[۲۶]

علمی نقوش از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، اشاعت ۱۹۵۷ء، میں اُردو املا کی تاریخ پر جامع مقالہ شائع ہوا۔[۲۷] اردو املا از غلام رسول ۱۹۶۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔[۲۸] ۱۹۶۹ء میں حکومت ہند کی جانب سے ترقیِ اُردو بورڈ کا قیام اور ۱۹۷۳ء میں املا کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔اس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر عابد حسین مرحوم تھے جب کہ ارکان میں رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شامل تھے۔کمیٹی نے ''اردو املا از رشید حسن خاں'' کا مسودہ منظور کیا۔۱۹۷۴ء میں ''املا نامہ'' از گوپی چند نارنگ شائع ہوا، نیز ترمیم شدہ ایڈیشن، ۱۹۹۰ء میں آیا تھا۔[۲۹] کمیٹی کی جو سفارشات املا کے متعلق تھیں وہ اس میں شائع کی گئیں۔اس کے ساتھ ہی رشید حسن خاں کی کتاب ''اردو املا''[۳۰] بھی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔(ان دونوں کتب کی اشاعت کی تفصیل مقدمے میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے) اس کے بعد تسلسل سے کتب منظرِ عام پر آئیں جنھوں نے نہ صرف اس روایت کو آگے بڑھایا بلکہ تعین اور یکسانیت کی راہیں ہموار کرنے کی بھی اہم کردار ادا کیا۔ان کی ترتیب وتفصیل یہ ہے۔

''اُردو املا اور رسم الخط''، ۱۹۷۷ء؛ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، [۳۱] اُردو املا وقواعد (مسائل ومباحث) از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۱۹۹۰ء [۳۲]؛ منتخب مقالات ''اُردو املا اور موزاوقاف'' مرتبہ گوہر نوشاہی ۱۹۸۲ء [۳۳]، سفارشاتِ اردو املا و رموزِ اوقاف از مجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء [۳۴]، اردو املا اور اس کی اصلاح از ابومحمد سحر ۱۹۸۲ء [۳۵]، اُردو رسم الخط اور املا از ابو محمد سحر ۱۹۹۹ء [۳۶]، اُردو قواعد واملا کے بنیادی اصول، محمد آفتاب احمد ثاقب، ۱۹۹۴ء [۳۷]، ''اُردو اِملا کی اصلاحی کوششیں'' نازیہ آفتاب ۲۰۱۲ء [۳۸]، املا نامہ: تخریب و ردِ تخریب، صباح الدین احمد ۲۰۱۴ء [۳۹] میں شائع ہوئی۔صحیح تلفظ ودرست املا از عقیل عباس جعفری ۲۰۱۹ء [۴۰]، اُردو املا: مسائل ومباحث (رشید حسن خاں کے حوالے سے) ابراہیم افسر، مرتب، ۲۰۲۲ء [۴۱]، لسانی تناظر، پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ (طبع اول ۱۹۹۷ء، ترمیم شدہ ایڈیشن ۲۰۱۲ء) [۴۲] اور سفارشاتِ اُردو املا، مرتبین ڈاکٹر رؤف پاریکھ، انجم حمید، عظمت زہرا، منظورِ عام پر ۲۰۲۲ء [۴۳] میں منظرِ عام پر آئی جسے اس وقت تک اردو میں اصلاحِ املا کی روایت کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں۔انجمن ترقی اردو کا ''املا نمبر'' حال ہی (۲۰۲۴ء) میں منظرِ عام پر آیا ہے جو تاریخی مباحث کا احاطہ کرتا ہے تاہم اس میں تازگی کا احساس نہیں ملتا۔[۴۴]

پاکستان و ہندوستان کے لسانی مباحث پر سیاسی اور مذہبی اثرات کا پرتو ہمیشہ غالب رہا ہے۔زبان وادب کے مسائل ومباحث مذہب، سیاست اور لسانی تعصب کے دائروں میں بھی گردش کرتے رہے۔پاکستان میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کی کوششیں اس لحاظ سے منفرد رہی ہیں کہ اس ادارے نے باقاعدہ مجالس، یکسی ناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد کر کے تعمیری مباحث کو بنیاد یا پلیٹ فارم مہیا کیا۔تائید و تردید، اختلاف واتحاد سے بھرپور مذاکروں اور یکسی ناروں کے ذریعے انفرادی واجتماعی کوششوں کا تنقیدی جائزہ سامنے آیا۔جمہور کا طرزِ اختیار کر کے املا کی اصلاح کے لیے تجاویز مرتب کیں۔

۲۰۲۲ء میں پاکستان میں ادارہ فروغِ قومی زبان اسلام آباد (سابقہ نام مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد) کے صدر نشین ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی اس موضوع میں خصوصی دلچسپی اور حالات کا تقاضا تھا کہ اردو املا کے ''تعین ویکسانیت'' کی

طرف پیش قدمی ہو سکے۔ اس لیے دوروزہ قومی سیمینار ''اردو املا کی معیار بندی: مسائل اور حل'' کا انعقاد ہوا اور قومی مجلس برائے سفارشاتِ اُردو املا کا قیام عمل میں لایا گیا۔ پورے پاکستان سے موضوع سے متعلقہ ماہرین اور اہلِ علم کو دعوت دی گئی۔ دوروزہ سیمینار میں مباحث کے ساتھ ساتھ مختلف کمیٹیاں بنا کر سفارشات تیار کی گئیں، بعدازاں قومی مجلس برائے سفارشاتِ اردو املا کی منظوری سے ''سفارشاتِ اُردو املا ۲۰۲۲ء'' کی صورت میں ایک اہم کتاب منظرِ عام پر آئی، جس میں روایت کا تسلسل بھی ہے اور کافی حد تک متفقہ املا کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ کتاب میں ''الف اور ہائے مختفی'' کی سفارشات کا باب ''ناپید'' ہے جس سے اس موضوع پر اختلاف کا عنصر پورے شد و مد سے ظاہر ہوتا ہے، تاہم املا کے دیگر اختلافی مسائل کے حوالے سے تعین اور ''معیاری املا'' کا خوش آیند پہلو سامنے آیا ہے، جس کی پیروی یکسانیتِ املا کا باعث بن سکے گی۔ راقم کو بھی ''مجلس برائے سفارشاتِ اردو املا'' کے رکن کا اعزاز ملا۔ ان سفارشات کو اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

اُردو اِملا کے مسائل کا حل اور علما کا مؤقف

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کا سہ روزہ سیمینار ۲۳ تا ۲۵ جون ۱۹۸۵ء کا انعقاد ''املا و رموزِ اوقاف کے مسائل'' کے حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے، کیونکہ یہ ایک لحاظ سے انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف شعوری سفر کا نقطۂ آغاز تھا۔ سیمینار میں مذکورہ موضوع پر علما کے درمیان مختلف الجہت مباحث کا رنگ نمایاں رہا اور کئی فکری و فنی نکات طشت از بام ہو کر سامنے آئے، جن میں اختلاف بھی رہا اور اتفاق بھی؛ ابتدا میں ہم درج بالا سیمینار کے کچھ اہم نکات جو دراصل املا اور علمائے املا کے سامنے ہر دور میں سامنے آتے رہے ہیں کو بنیاد بنا کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی نکات (مشمولہ دیگر) آئندہ ابواب میں اہم مباحث کو بنیاد فراہم کریں گے اور ہمیں اس روایت کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔

سیمی نار کے اکثر ماہرین میں اردو املا کے حوالے سے مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوششیں کی گئیں، قراردادوں کے ذریعے مختلف مسائل کی نشاندہی اور حل تلاش کرنے کی تجاویز دی گئیں۔ اعجاز راہی کے مطابق مقتدرہ کی جانب سے اس سیمی نار کا انعقاد اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ زبانوں کی تخلیق وارتقا اور ان میں حک و اصلاح، ترمیم و تنسیخ کے فطری قواعد اور شعوری کاوشوں کے کردار سے کماحقہٗ آگاہ ہے۔ حرف وصوت کو قریب تر لانے کے لیے جہاں مقالہ نگاروں کے درمیان نظری و فکری بُعد سامنے آیا وہاں اس مسئلے کے حل کے امکانات کی تلاش کی اہمیت کے متعلق اتفاق کا پہلو بھی نمایاں رہا۔ بعض مقالہ نگاروں کا خیال رہا کہ مروّجہ املا کو ہی برقرار رکھا جائے، کیونکہ ماضی میں عوام کی سطح پر املا و تلفظ میں اصلاحات کے حوالے سے جتنی کوششیں ہوئیں وہ ناکام ثابت ہوئیں، ان کے خیال میں زبان کا ایک فطری عمل ہوتا ہے جو عوام کے مزاج کے سانچوں میں ڈھلتا آگے بڑھتا ہے، اس لیے مروّجہ انداز ہی کو برقرار رکھا جائے۔ [۴۴] بعض ماہرین کی رائے تھی کہ غلط املا اور تلفظ پر صاد کرنا، دخیل الفاظ کو اپنی اصل سے منقطع کرنے کے مترادف ہے، جس سے وہ اپنے معنوی و ثقافتی پس منظر سے محروم ہو جائیں گے۔ [۴۵] نیز لکھی جانے والی زبان بولنے والی زبان کی بھرپور نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی، تاہم لکھے جانے والے لفظ کو بولنے والے لفظ کے قریب تر لانے کی کوششیں ہر دور میں ہوئی ہیں، نیز املا کی یکسانیت کے سلسلے میں فکر و نظر اور عملی طریقِ کار میں ہمیشہ فرق رہا ہے۔ [۴۶]

ڈاکٹر وحید قریشی، صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے املا کے مسائل کے حوالے سے فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا تھا جن کے چیدہ نکات درج ذیل ہیں:

ان کے خیال میں عامۃ الناس کی شرکت کے بغیر زبانوں میں اصلاح و تبدیلی کی ہر کوشش ناکام رہی ہے۔ املا کو صوتیاتی آہنگ سے مربوط کرنے کا مسئلہ ہر زبان کے سامنے رہا ہے۔ سائنسی انکشافات اور دوسرے جدید علوم و ایجادات کے بعد ہر زبان کو شکست و ریخت کے عمل سے گزرنا پڑا ہے اور ہر زبان نے صوتیاتی نظام کی مکمل نمائندگی کے لیے اپنے املائی نظام میں قابلِ لحاظ تجربے کیے۔ گزشتہ پون صدی میں خود انگریزی کو امریکی نظامِ اصوات کے تابع کرنے کے لیے کوششیں ہوئیں، یہ کوششیں کہاں تک نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور امریکی املا پذیرائی حاصل کر سکی یا نہیں؟ یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ دنیا کی کوئی زبان بھی اپنے اصوات کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اردو زبان بھی ان سیکڑوں زبانوں میں سے ایک ہے، جسے حرف وصوت کے مابین تفاوت کا دوسروں کی نسبت زیادہ گمبھیر سامنا ہے کہ املا میں معیار بندی کا مسئلہ بھی گاہے بہ گاہے اٹھایا جاتا رہا ہے۔ اصلاح کی کوششیں بھی ہوئیں، مگر بیشتر اصلاحات شرفِ قبولیت حاصل نہ کر سکیں۔ زبانوں کے ارتقا کے سفر میں حک و اصلاح کا عمل فطری ترتیب میں تسلسل برقرار رکھتا ہے، یہ نہ تو کلیتہً شعوری کاوشوں کی نیابت کرتا ہے، اور نہ ہی اس سے گریزاں رہ سکتا ہے۔ ارتقا کا عمل نہ تو خودرو یا خودکار نظام کے تابع ہے اور نہ ہی حک و اصلاح کا سارا عمل محض اجتہاد پر ہوتا ہے۔ اصلاً عصری تقاضے فطری ترتیب میں ایک ایسی فضا تشکیل دیتے ہیں، جو دانشورانِ عصر کی تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں کی مشارکت سے اصلاح و تبدیلی کے عمل میں بنیادی صیغے کا کردار ادا کرتی ہے۔ [۴۸] وہ لکھتے ہیں:

''حرف وصوت کی تبدیلی کے پس منظر میں بسا اوقات برسوں اور صدیوں کی ستیزہ کاری دکھائی دیتی ہے اور لفظ اصل رابطوں سے کٹ کر بالکل نئی آواز اور ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے ایک طرف (سوں، ساں، سے) کو وجود برسوں کے عمل املا اور تلفظ کے کئی روپ اختیار کرنے کے بعد ملا تو دوسری طرف تمیز، تعیّن، حرَکت، برَکت وغیرہ؛ جیسے دخیل الفاظ کو اپنے صوتی نظام کے تابع (یعنی تمیز، تعین، حرکت، برکت وغیرہ) کرنے کے لیے بھی کم و بیش اتنا وقت صرف ہوا اور بیک جنبشِ قلم انھیں رد کیا گیا..... ہر زبان کی اشکال مسلسل تغیرات کا نتیجہ ہوتی ہیں، ہر زبان کا نظامِ اصوات اور ہر زبان کا قلبِ ماہیت کرتے منطقے، ہر دور کے جغرافیائی، سماجی، ثقافتی حالات، حک و اصلاح کے شعور کے مابین منضبط رشتوں کے سبب ہمیشہ ارتقا پذیر رہتے ہیں۔ ان عناصر کی ترتیب کے پس منظر میں ضروریات، خواہشات اور تقاضے توانائی کا کام کرتے ہیں۔ اگر لفظ غیر فطری انداز میں جنم لیتا ہے یا اپنے جغرافیائی اور ثقافتی پس منظر میں تشکیل پانے کے بجائے دوسری زبانوں سے دخیل ہوتا ہے اور اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی صوت وصورت میں تبدیلی نہ کی جائے تو املا اور تلفظ کا مسئلہ جنم لیتا ہے.... کسی زبان کا لفظ کسی دوسری زبان میں داخل ہوتا ہے تو یہ زبان لفظ کو اپنے نظامِ اصوات کے تابع کرنے کے لیے یقیناً کسی جست سے کام نہیں لیتی، جب کوئی لفظ زبان میں داخل ہوتا ہے تو ان تبدیلیوں کے پیچھے ایک طویل زمانی تسلسل (Time quantum) اور زمانی علائق (Spatial relation) کے ساتھ ساتھ عصری ادراک، استدلالیت اور تراش خراش کی

فطری جبلت یکساں دخیل ہوتے ہیں، جیسے اصل اشکال میں تبدیلی کا غیر فطری الحاقی محاکمہ، نارسیدگی یا جبری شعوری کوششیں یا تجربہ لفظ کی عامتہ الناس میں قبولیت کی ضمانت نہیں بن سکتا، اسی طرح عصری دانش کی شرکت کے بغیر زمانی و مکانی تسلسل بھی لفظ کے قبولِ عام کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ انسانی تاریخ پر نظر ڈالنے سے جو انسانی ارتقا دکھائی دیتا ہے وہ کسی منظم ارتجال کا نتیجہ نہیں بلکہ انسانی ارتقا سے ارتباط کا فطری ترتیب میں منظم استدلال ہے۔'' [۴۹]

رشید حسن خاں نے کچھ اہم مسائل یا ضروریاتِ املا کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھا تھا:

پچیس چھبیس برس تک اس موضوع پر کام کرتے رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ بنیادی مسئلہ صرف ایک ہے اور وہ ہے عدم تعین۔ یعنی بہت سے لفظوں کے اجزائے ترکیبی کا واضح طور پر تعین نہ ہونا، اسی عدم تعین نے ساری الجھنیں پیدا کی ہیں۔ جس نے اپنے استاد سے جس طرح سیکھا وہ اس طرح لکھتا ہے۔ املا کو کوئی مستقل موضوع نہیں مانا گیا۔ [۵۰] املا کے مسائل پر عموماً غور نہیں کیا جاتا اور تقلید یا روایت کی بنیاد پر الفاظ کی تحریر، تکرار کے ساتھ کی جاتی ہے۔ لغات میں بھی اکثریت یا بعض الفاظ کے حوالے سے عدم یکسانیت کا پہلو پورے شد و مد سے موجود ہے۔ املا اور رسم الخط کو خلط مبحث کر دیا گیا ہے، املا کے مسائل کو رسم الخط بنایا گیا اور رسم الخط کے مسائل کو املا کے زمرے میں ڈال دیا گیا۔ تغیر: تغیرات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصلاح: عربی کے الفاظ الف مقصورہ کی بجائے سے لکھے جائیں [اعلیٰ، اعلا] [ادنیٰ، ادنا]۔ تغیر رونما ہوا کرتا ہے جب کہ اصلاح نافذ کی جاتی ہے، اصلاح کا مقصد کسی کمی کو دور کرنا جبکہ صحت سے مراد یہ ہے کہ بعض الفاظ کی غلطی دور کی جائے، یعنی تواتر سے جو غلطی چلی آرہی ہے اسے مسلمہ انداز میں درست کیا جائے۔ یہ بات نہیں تھی کہ "اعلیٰ" میں بجائے خود املا کی کوئی غلطی تھی۔ غلطی کی تصحیح کی جائے گی، اسے اصلاح نہیں کہا جائے گا۔" [۵۱] امالہ کا تعلق بھی املا سے ہے۔ تغیر، اصلاح اور تصحیح کے علاوہ ایک اور لفظ بھی ہے جسے "ترجیح" کہا جاسکتا ہے۔ [۵۲]

بعض الفاظ کے املا کے حوالے سے لغات میں مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ دبستانی اختلافات بھی اس معاملے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اختلافات کو ایک طرف رکھ کر "یہ فیصلہ" کرنا ہوگا کہ اس کی مرجح صورت کون سی ہونی چاہیے؟ یعنی ترجیح کس کو دینی چاہیے۔ ان کے خیال میں:

"املا کی صحت اور اصلاح بہت ضروری اور ترجیحی صورتوں کا تعین بھی ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ اس بات کو بھی مان لینا چاہیے کہ املا میں انقلابی تبدیلیوں کی گنجائش نہیں۔ اصلاحِ املا کے ذیل میں بعض لوگوں نے انقلابی تجویزیں پیش کی ہیں، ایسے مضامین کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دو باتوں پر خاص زور دیا گیا ہے، ایک تو یہ کہ اردو میں ایک آواز کے لیے ایک حرف ہونا چاہیے، دوسری بات یہ کہ جو حرف پڑھنے میں نہیں آتے، ان کو لکھا بھی نہ جائے۔ یہ دونوں تجویزیں اصلاح کے بجائے تبدیلی کا حکم رکھتی ہیں۔ اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا کہ ایسی تبدیلیوں کا نفاذ ممکن ہے؟ اصلاح اور تصحیح کی اس قدر گنجائش نہیں ہوتی، یہ دو باتیں بالکل مختلف عمل ہیں، اس سلسلے میں اس بات کو بھی فراموش کر دیا گیا کہ دنیا کی کوئی بھی زبان تحریری سطح پر اس حد تک سائنٹفک نہیں کہ اس میں خامیاں نہ ہوں۔" [۵۳]

ان کی یہ بات درست ہے کہ "ایسی کوئی زبان نہیں جس میں ایسی بہت سی مشکلیں اور اُلجھنیں موجود نہ ہوں۔ یہ مشکلیں زبانوں کے رگ و ریشے میں پیوست ہوچکی ہیں اور زمانۂ دراز کے عملِ ارتقا کے وسیلے سے وہ مختلف اجزا؛ زبان میں جذب ہوچکے ہیں۔" [۵۴]

اُردو املا میں اصلاح کے حوالے سے بعض انقلابی تجاویز بھی سامنے آئیں جیسے:

☆ اردو میں ایک آواز کے لیے ایک حرف ہونا چاہیے۔

☆ جو حرف پڑھنے میں نہیں آتے، انھیں لکھا نہ جائے۔

تاہم رشید حسن خاں کا خیال تھا کہ ایسی تجاویز پیش کرنے والوں میں سے بعض صاحب نظر تو علمِ لسانیات کے مارے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ اپنے اس خیال یا دوسروں کے اس اعتراض سے متاثر تھے کہ اردو املا میں ساری خرابیاں ہم آواز حرفوں اور زائد حرفوں کی پیدا کی ہوئی ہیں، مگر یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ [۵۵] ایسی تجاویز کا نقصان یہ ہوا کہ صحتِ املا کے حقیقی مسائل کی طرف توجہ پوری طرح مبذول نہ ہو پائی۔ [۵۶]

رشید حسن خاں کی تجاویز درج ذیل تھیں:

☆ اردو رسم الخط کو نہیں بدلا جاسکتا۔

☆ اردو املا کا معیار خطِ نستعلیق ٹھہرنا ہوگا۔

☆ املا میں انقلابی تبدیلیاں نہیں کی جاسکتیں۔

☆ املا میں غلط نگاری نے بہت کچھ راہ پالی ہے، عدم تعین نے انتشار پھیلا رکھا ہے۔

☆ الفاظ کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے، تصحیح کا مکمل گوشوارہ تیار کیا جائے۔

☆ اِملا کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے دیکھا جائے، اور اس حیثیت سے اس کے ضابطے مرتب کیے جائیں۔

☆ فارسی املا اور اردوئے قدیم کی روش کا خیال رکھا جائے۔ [۵۷]

اردو املا اور اس کی اصلاح کا موضوع بھی متنازعہ فیہ رہا ہے۔ املا کی اہمیت و افادیت اور ہمہ پہلو ضروریات کے تناظر میں جن علما نے اس موضوع کے متعلق لکھا ان میں سے اکثر انتہائی حساس نظر آئے جب کہ بعض اس کی گہرائی و افادیت کا اس طرح اندازہ نہ کرسکے، جتنی ضرورت تھی۔ ابو سلمان شاہجہان پوری کی یہ رائے درست تھی کہ جب تک املا کا مسئلہ علمی تھا ایک محدود حلقۂ فکر اور دائرۂ بحث و نظر کا مسئلہ تھا، لیکن موجودہ حالات میں یہ ایک عمومی مسئلہ ہے۔ اہلِ زبان، اصحابِ علم و فکر اور لسانیات کا خاص ذوق رکھنے والوں کا مسئلہ ہے۔ [۵۸] حقیقت یہ ہے کہ آج تو املا کا مسئلہ تدریس، ذرائع ابلاغ اور ٹیکنالوجی کی اہم ترین ضرورت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

ذیل میں اصلاحی عمل کی افادیت اور حل کے طریقِ کار کے متعلق دیگر علما کے نقطہ ہائے نظر کا احاطہ کیا جاتا ہے تا کہ تاریخی روایت کے پس منظر کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

غلام رسول کا خیال تھا کہ ہماری زبان اور ادب کی تعلیم شروع ہی سے علمائے فارسی، عربی کے زیرِ تربیت ہوتی رہی ہے، اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی، عربی کے اثرات اردو رسم الخط پر پڑے، جس سے اردو املا بھی متاثر ہوا۔ [۵۹]

مسعود حسین خاں کے حروفِ تہجی کے نظریے سے اگرچہ عمومی اختلاف کی تفصیل آگے آئے گی تاہم یہاں ان کی رائے نقل کی جاتی ہے:

''اِملا کے اعتبار سے جس قدر انتشار اردو زبان میں ملتا ہے اس کی نظیر کہیں اور ملنا دشوار ہے، اس نے اپنے ارتقا کے ابتدائی مدارج میں خطِ نسخ اختیار کیا، شمالی ہند میں بعد میں اس کے لیے نستعلیق کا استعمال کیا جانے لگا، چونکہ اس کے حروف تہجی کا مکمل طور پر تعین نہیں ہو سکا ہے، اس لیے آج بھی بہت سے الفاظ مختلف املا سے لکھے جاتے ہیں، عربی زبان کی صورت اب تک حرف و صوت پر قائم ہے۔'' [۶۰]

خلیق انجم کی تجاویز تھیں:

۱: اردو کی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے املا وغیرہ کی بحث میں عربی اور فارسی کے قاعدے کا ہرگز ذکر نہ کیا جائے۔

۲: الفاظ کے املا کے تعین کے سلسلے میں نور اللغات، فرہنگِ آصفیہ اور دوسری لغتوں کا حوالہ نہ دیا جائے، یہ لغت انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں اور ان کی بنیاد غیر سائنٹفک ہے۔

۳: اگر کوئی لفظ ایک سے زیادہ طریقوں سے لکھا جاتا ہو تو ادبی، غیر ادبی، علمی، سیاسی، صحافتی اور سائنسی تحریروں کے بعض نمونے منتخب کر کے متنازعہ فیہ الفاظ کے کارڈ بنائے جائیں اور یہ پتہ لگایا جائے کہ متعلقہ الفاظ کی املا سب سے زیادہ کس طریقے سے کی جاتی ہے، اسی املا کو ترجیح دی جائے جو سب سے زیادہ مستعمل ہو۔ کمیٹی کی فوری تشکیل کی جائے جو اردو املا میں پھیلائے ہوئے نراجیت کو دور کر سکے۔ [۶۱]

شان الحق حقی کے خیال میں زبان کوئی جامد یا پتھرائی ہوئی شے نہیں، ہر جیتی جاگتی، پھلتی پھولتی شے کی طرح اس میں بھی افزائش و نمو کا عمل ہوتا رہتا ہے، زبان جتنی چلتی ہے اتنی بدلتی رہتی ہے۔ ناسخ نے متروکات کو چھانٹا تو انھیں کیا معلوم تھا کہ زمانہ ایک دن خود ان کے معیارِ فصاحت پر بھی خطِ تنسیخ پھیر دے گا۔ [۶۲] مرتبینِ لغات واضعینِ لغت نہیں ہوتے، نہ انھیں اپنی طرف سے یہ حکم لگانے کا حق ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط...... عموماً طبقۂ اعلیٰ کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ معیار ہمیشہ اوپر سے نہیں بلکہ نیچے سے ابھر کر سامنے آتا ہے، البتہ اوپر کا طبقہ معیار کا پاسبان بن جاتا ہے، جو کچھ عوام بولتے ہیں وہ رفتہ رفتہ خواص بھی قبول کر لیتے ہیں۔ خصوصاً ایک ترقی پذیر معاشرے میں جہاں نچلا طبقہ اوپر ابھر کر آتا ہے، یہ عمل اور بھی تیزی سے ہوگا...... روما کی عوامی زبان جسے Low latin کہتے ہیں بالآخر ٹکسالی زبان بن گئی جس کی آج تک دنیا میں دھوم ہے، جنوبی ایشیا میں پراکرتیں، سنسکرت پر غالب آ گئیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت الفاظ کے معنی اور تلفظ وغیرہ میں جو تصرفات ہوئے ان کے بانی علما یا پنڈت نہیں ہو سکتے تھے یہ عوام ہی تھے جنھوں نے سُوال کو سوال اور اکال کو کال بنایا۔ [۶۳]

بقول شان الحق حقی اردو کی چار خصوصیات ہیں:

۱: اس کی صوتیات عربی، فارسی، انگریزی ہر زبان سے بڑھ کر ہیں اور زیادہ جامع، چنانچہ یہ اکثر دوسری زبانوں کے الفاظ کو جوں کا توں اپنا سکتی ہے، تعریب، تفریس کی طرح تورید چنداں ضروری نہیں ہوتی۔ اب تو پڑھے لکھے لوگ سکونِ اول پر بھی قادر ہوتے جاتے ہیں جو ایک نئی تبدیلی ہے، جیسے: سپیشل، سپوٹنک وغیرہ۔

۲: مصادر ڈھالنے کی بڑی صلاحیت جو عربی، فارسی میں نہیں، جبکہ دوسری زبانوں کے مصادر لگے بندھے ہیں۔

۳: سابقوں، لاحقوں کی تعداد غالباً دنیا کی ہر زبان سے زیادہ ہے۔

۴: اس کی ترکیبِ نحوی جو ایک آغوشِ کشادہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر بیرونی لفظ کو آسانی سے سما لیتی ہے۔ اسم، فعل، حرف، متعلقِ فعل ... فجائیہ سب کلمے اور فقرے اور امثال بلا تکلف کھنچے چلے آتے ہیں۔ [۶۴]

خلیل صدیقی کے مطابق املا کی اصلاح کے سلسلے میں مختلف سطحوں پر بہت کچھ لکھا گیا، صحیح املا کے لیے صحیح حروف مقرر کیے گئے مگر یہ سب کچھ ایک مرکزی ادارے کی طرف سے نہیں ہوا، جسے پورے لسانی معاشرے میں بلا حیل و حجت، مستند اور با اختیار سمجھا جاتا۔ املا کے اصول بار ہا منضبط ہوئے مگر عمومی مقاصد در آمد نہ ہو سکے۔ کتابت کے فن نے املا کو کاتبوں کے رحم و کرم پر چھوڑا، غلط املا کی طباعت و اشاعت نے اسے اور نقصان پہنچایا، کیونکہ عوام کے لیے مطبوعہ املا سند ہو سکتا ہے۔ اعراب کو تو بھلا دیا گیا، تین حروف دس مصوتوں اور دس انفیائی مصوتوں کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں، مبتدیوں کے لیے (و) اور (ی) کی مصوتی اور مصمتی حیثیتوں کی تفریق مشکل ہو گئی۔ اگر مصوتی علامتوں کی تجویز کردہ ترمیمیں رائج ہو جائیں تو املا کی بہت سی مصوتی قباحتیں ختم ہو سکتی ہیں۔ [۶۵] تہذیبی سفر کے ساتھ ساتھ زبان میں جو بتدریج لیکن غیر محسوس تغیرات ہو رہے ہیں، انھیں محفوظ رکھتے ہوئے املا کے قواعد و ضوابط پر حسبِ ضرورت نظرِ ثانی ہوتی رہے۔ [۶۶]

مظفر علی سید املا یا معیار بندی کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے، ان کے خیال میں املا کے عناصرِ اربع درج ذیل ہیں:

۱: تلفظ ۲: اشتقاق ۳: مماثلت ۴: دستورِ عام

املا میں تلفظ کے علاقائی اور زمانی تغیرات کو صرفِ نظر انداز ہی نہیں کیا جاتا بلکہ املا تو ان پر اثر انداز بھی ہوتا ہے، پھر یہ بھی کہ معیار بندی محض املا کی حد تک کیوں؟ کیا تلفظ کے سلسلے میں معیار بندی کی ضرورت نہیں؟ [۶۷] اردو کو تنوع اور تمول کے ساتھ پھلنے اور پھولنے کا موقع ملنا چاہیے اور یہ بول چال کے علاوہ کسی حد تک ہمارے طرزِ کتابت و طباعت میں بھی ہونا چاہیے۔ [۶۸]

رشید امجد کا خیال تھا کہ موجودہ صورت میں جب کہ فطری ارتقا اور برسوں کے عمل کے بعد الفاظ، املا اور تلفظ کی صورتیں اپنی پہچان کرا چکی ہیں، انھیں تبدیل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ [۶۹]

شان الحق حقی کی رائے تھی کہ زبان کے معاملے میں چلن کو اشتقاق پر فوقیت رہی ہے حتیٰ کہ قواعد پر بھی محاورہ غالب رہا ہے۔ [۷۰] ہر شائستہ زبان کے لیے معیار کا ہونا شرط ہے۔ [۷۱] زبان کا دھارا ماقبل از تاریخ سے چلا آتا ہے اور اس میں کئی سوتے آ کر ملتے ہیں اور تغیر و ترمیم کا عمل جاری رہتا ہے۔ تلفظ کا مقامی اختلاف جو فطری مخارج سے تعلق رکھتا ہے چنداں اہم نہیں ہے۔ ہم عربی کے حروف ث، ح، ذ، ض، ط، ظ یا ق عربوں کی طرح ادا نہیں کرتے، اسے تکلف بجا کہیں گے بلکہ بعض صورتوں میں مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ یہ حروف عموماً الفاظ کی شناخت کے لیے ایک تاریخی تبرک کے طور پر ہمارے ہاں موجود ہیں اور اس میں مضائقہ نہیں۔ املا اور تلفظ میں بھی مکمل مطابقت نہیں ہوتی، اس بے قاعدگی میں سب زبانیں شریک ہیں۔ اُردو املا میں اتنی بے ضابطگی نہیں، جتنی بعض اور زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی وغیرہ میں ہے، جہاں انتشار انتہا پر ہے۔ آپ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کون سا حرف کیا صوتی قدر رکھتا ہے، مراد یہ ہے کہ ہم عربی مخارج پر حاوی نہ ہوں، اعراب یا حرکات ضرور صحیح لگاتے ہیں، لفظ کے معنی و محلِ استعمال کی بابت ضرور احتیاط برت سکتے ہیں۔ [۷۲]

ڈاکٹر سعید اختر درانی کے خیال میں زبانیں اخذ و استفادے کی صورت میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کے لیے قطع و برید اور تصرف کے عمل سے

گزارتی ہیں۔[۷۳]

شمس الرحمان فاروقی کا موقف بھی حقیقت پسندانہ تھا کہ زندہ زبانیں بدلتی رہتی ہیں، الفاظ و استعمالات کے ردو قبول کا مسلسل عمل اس تبدیلی اور اس کے باعث زبانوں کی تبدیلی کا ضامن ہے۔[۷۴] تبدیلی آنکھ بند کر کے قبول کرنا یا نئے، پرانے لفظوں کو کسی مصنوعی تصورِ اصلاح یا تصورِ ارتقا کے دباؤ میں آ کر مسترد کرنا، یہ دونوں رجحانات ترقی پذیر اور ترقی یافتہ زبانوں کے بولنے والوں کا شیوہ نہیں۔[۷۵] ''لغاتِ روزمرہ'' میں رواجِ عام کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے، اور زبان کی آزاد لسانی حیثیت جس طرح اور جس حد تک آج معرضِ خطر میں ہے، پہلے نہ تھی۔[۷۶] اکثر علما اور شعرا اس بات پر بھی اڑے رہے ہیں کہ ''عربی، فارسی'' الفاظ کو ایک خاص تقدس حاصل ہے اور اچھی اردو لکھنے اور بولنے والے کو چاہیے کہ وہ اسے کسی بھی طرح مجروح نہ ہونے دے۔۔۔نئے لوگ ملک میں آئیں، یہ اچھی بات ہے لیکن یہ دیکھنا اشد ضروری ہے کہ ان کا آنا ضروری یا فائدہ مند ہے کہ نہیں، یا اگر ضروری یا فائدہ مند ہے تو نقصان دہ تو نہیں ہے؟ اس طرح تمام نئے مشکوک استعمالات اور الفاظ کو غور سے دیکھنا چاہیے اور ان کی مخالفت کرنی چاہیے۔[۷۷] وہ لکھتے ہیں:

''لکھنے اور بولنے کی زبان میں کئی طرح کے فرق ہوتے ہیں، اردو میں یہ فرق کم سے کم ہے لیکن پھر بھی ہے اور یہ فرق روز بروز بڑھتا جارہا ہے کیونکہ انگریزی الفاظ آج جس کثرت سے بولے جارہے ہیں اور ان کا اردو متبادل نہ تو دریافت کیا جارہا ہے اور نہ بتایا جارہا ہے۔ زبانوں کے ارتقا میں اہلِ مکتب عام طور پر کوئی خاص کردار ادا نہیں کرتے۔ زبان بولنے والوں کا سوادِ اعظم لسانی عمل کو صحیح پن Validity عطا کرتا ہے، اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے تقریباً ہر جگہ ''صحت زبان'' اور اتباعِ اہلِ فارسی'' کا دور دورہ ہوگیا، یہ رجعت پسندانہ مزاج کیوں بند ہوا، اسے اردو ادبی تہذیب کی تاریخ کا ایسا معمہ کہہ سکتے ہیں جو ہنوز حل طلب ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس معمے کے وجود ہی سے ہم بے خبر رہیں، تو پھر اس کا حل کہاں ڈھونڈتے ؟ شاہ خاتم نے عربی فارسی الفاظ کو ان کے اصل تلفظ کے ساتھ نقل کرنے کی سفارش کی تھی۔''[۷۸]

حواشی / حوالے

۱: مظفر علی سید، حرف و صوت کا رشتہ، مشمولہ املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، طبع اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۹۹

۲: مظفر علی سید، حرف وصوت کا رشتہ، مشمولہ املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، طبع اول، ص ۹۸

۳: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، جامع القواعد، طبع اول، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء، ۱۶۸

۴: ڈاکٹر ابو محمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، طبع اول، بھوپال، مکتبہ ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۹

۵: شازیہ آفتاب، اردو میں اصلاحِ املا کی کوششیں، طبع اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء، ص ۷

۶: سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، تذکرۂ جلوۂ خضر، جلد اول، پٹنہ، مطبع نورالانوار، ۱۸۸۵ء، نیز سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، تذکرۂ جلوۂ خضر، جلد دوم، پٹنہ، مطبع نورالانوار، ۱۸۹۷ء

۷: فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی بنیاد انگریز گورنر جنرل مارکوئیس ولزلی نے ٹیپو سلطان کی شکست اور انگریزوں کی فیصلہ کن فتح (۴ مئی ۱۷۹۹ء) کی پہلی سالگرہ (۴ مئی ۱۸۰۰ء) کے موقع پر رکھی تھی۔ اس کالج کا بنیادی مقصد ان انگریز افسران کی تعلیم و تربیت کرنا تھا جو پندرہ، سولہ سال کی عمر میں انگلستان سے بھرتی کر کے ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ تعلیم و تربیت کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ وہ نہ صرف اپنے فرائضِ منصبی ادا کرسکیں بلکہ ''مشرق میں برطانوی طاقت کے پُرجوش حامی بن کر دنیا کے اس حصے میں عیسائی مذہب کو بھی قائم کرسکیں۔'' علاوہ ازیں ادب و سائنس کے عمومی اصولوں سے واقفیت حاصل کرسکیں اور وہ حکومتِ وقت کے قوانین اور برطانیۂ عظمیٰ کے آئین سے بھی واقف ہوں۔ ساتھ ہی وہ ہندوستان اور دکن کی دیسی زبانوں سے بھی واقف ہوں۔ تاکہ حسن وخوبی سے حکومت چلانے اور برطانوی سلطنت کے استحکام کے ساتھ ساتھ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفادات اور وقار کے بھی نگہبان ہوں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، جلد سوم، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۴۰۷ تا ۴۱۲

۸: رشید حسن خاں، اردو املا کے بنیادی مسائل، مشمولہ ارمغانِ علمی (وحید قریشی کی علمی و ادبی خدمات) مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، عارف نوشاہی، تحسین فراقی، طبع اول، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۰

۹: دیبی پرشاد، رسالہ معیار الاملا، طبع اول، کان پور، مطبع نول کشور، ۱۸۹۷ء

۱۰: مولوی نذیر احمد، رسم الخط، یعنی قواعد املا و انشائے خط (عربی، فارسی، اردو) طبع اول، علی گڑھ، مطبع انسٹیٹیوٹ، ۱۸۷۷ء

۱۱: امیر اللغات، امیر مینائی، طبع اول، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۱ء،

۱۲: امیر مینائی کا خط بنام آہ، مشمولہ، امیر مینائی، شاہ ممتاز آہ، یکم دسمبر ۱۸۹۰ء، ص ۳۰۲، ۳۰۴، بحوالہ ڈاکٹر ابو محمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، ص ۱۰

۱۳: ڈاکٹر ابو محمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، ص ۱۲

۱۴: ڈاکٹر ابو محمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، ص ۱۲

۱۵: آغاز ۱۹۰۳ء، تا ۱۹۴۷ء۔ اس کے قیام کا فیصلہ ''آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کے سولھویں اجلاس منعقدہ دہلی ۲۷ دسمبر ۱۹۰۲ء تا ۴ جنوری ۱۹۰۳ء، میں ہوا۔ اس سے پہلے کانفرنس کے تین شعبے: تعلیمِ نسواں، تعلیمی مردم شماری، مدارس کام کر رہے تھے، جب کہ اس کانفرنس میں مزید تین شعبوں: سوشل رفام، لٹریری اور امور متفرقات کا اضافہ ہوا۔ لٹریری سیکشن کے سیکرٹری شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی مقرر ہوئے تھے۔ مولانا شبلی اور مولانا غلام الحسنین کے مطابق ''انجمن ترقیِ اُردُو'' کے قیام کی تجویز ۴ جنوری ۱۹۰۳ء کو منظور ہوئی، تاہم اس کا دستور ۱۸ اپریل ۱۹۰۳ء کو شائع کیا گیا۔ ملاحظہ ہو: انجمن ترقی اردو (ہند) تاریخ اور خدمات (۱۹۴۷ء تک) مصنف ڈاکٹر محمد یونس، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۸ء، نیز انجمن ترقیِ اردو [ہند] کی علمی اور ادبی خدمات، (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک) ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، لیتھو کلر پرنٹس علی گڑھ، ۱۹۹۰ء

۱۶: دائرۃ المعارف: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (دائرہ معارف اسلامیہ) ۲۶ جلدوں میں دانش گاہِ پنجاب یعنی پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے زیرِ اہتمام تیار کیا گیا۔ جس میں کسی بھی موضوع، معروف شخصیات، شہروں کے حالات وغیرہ با آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے بنانے کی تجویز ۱۹۴۰ء میں اورینٹل کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع نے دی تھی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے پنجاب یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ اجلا س ۱۹۴۸ء میں ''اردو دائرہ معارف'' مرتب کرنے کی تجویز دی تو منظور ہوگئی اور ۱۹۵۰ء سے اس پر باضابطہ کام شروع ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں پہلی جلد شائع ہوئی۔ ۱۹۹۳ء تک ۲۴ جلدیں شائع ہوئیں۔ ۱۹۹۷ء میں ۵۰ سال پورے ہونے پر ''مختصر اردو دائرہ معارف'' ایک جلد میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے ''تکملہ دائرہ معارف'' کے نام سے مزید دو جلدیں (پہلی ۲۰۰۲ء اور دوسری ۲۰۰۸ء) میں شائع کیں۔

۱۷: محکمہ تعلیم: مراد سر رشتہ تعلیم پنجاب ہے، جس کی جانب سے املا کی علامات مقرر کر کے منظور کی گئی تھیں اور صوبۂ دہلی کی درسی کتب میں ان پر (۱۹۴۱ء و مابعد تک) عمل درآمد ہوتا رہا جب کہ اس کے مقابلے میں بقول برجموہن دتاتریہ کیفی ''صوبۂ متحدہ کی درسی کتابوں میں کتابوں کا التزام بہت ناقص تھا۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: کیفیہ، برجموہن دتاتریہ کیفی، لاہور، مکتبہ معین الادب، اردو بازار، سن تصنیف ندارد، ص ۳۴۸

۱۸: مکتبہ فرینکلن: یہ ایک نجی ادارہ تھا جس کا قیام امریکہ میں ۱۹۵۲ء، کو ہوا اور ۱۹۷۸ء، تک جاری رہا۔ اس نے مختلف اداروں جیسے امریکن لائبریری ایسوی ایشنز، انٹرنیشنل ریلیشنز کمیٹی، امریکن بک پبلشرز کونسل فارن ٹریڈ کمیٹی وغیرہ کے ساتھ اشتراک پر کام کیا۔ (اردو فرینکلن پروگرام) مکتبہ فرینکلن کا آغاز ۱۹۵۴ء، میں لاہور سے کیا گیا۔ جس نے ۵۰۰ سے زیادہ امریکی مصنفین کی کتب پاکستانی ادیبوں سے بھی ترجمہ کرائیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

http://guides.loc.gov/frankline-book-programme-collection/urdu

۱۹: ترقی اردو بورڈ: حکومتِ ہند نے اردو زبان کی ترقی کے لیے ۱۹۶۹ء، میں ترقیِ اردو بورڈ قائم کیا تھا۔ ترقی اردو بورڈ نے ۱۹۷۳ء، میں اردو املا کو معیاری بنانے کے لیے املا کمیٹی کی تشکیل کی تھی۔ جس

کے صدر سید عابد حسین تھے جب کہ ارکان میں رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شامل تھے۔ ۱۹۷۴ء میں کمیٹی نے سفارشات مرتب کر کے پیش کیں جب کہ ۱۹۷۳ء میں ہی کتاب ''املا نامہ'' شائع ہوئی، اس ادارے نے بہت ساری کتب شائع کیں۔

۲۰: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، قیام ۴ر اکتوبر ۱۹۷۹ء۔ یہ آئینِ پاکستان کی دفعہ ۲۵۱(۱) کے مقاصد کی بجا آوری کے لیے بنایا گیا تھا تا کہ حکومت کو ''اردو'' کی بحیثیت سرکاری زبان، باقاعدہ نفاذ کے لیے طریق کار اور سفارشات پیش کر سکے۔ دسمبر ۲۰۱۲ء، میں اس کا نام ادارۂ فروغِ قومی زبان رکھا گیا۔

۲۱: ڈاکٹر ابومحمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، ص ۱۲، ۱۳

۲۲: ڈاکٹر ابومحمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، ص ۱۳

۲۳: ڈاکٹر ابومحمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، ص ۱۳

۲۴: پروفیسر آل احمد سرور، اردو رسم الخط؛ علمی و تنقیدی نقطۂ نظر سے، مشمولہ اردو میں لسانیاتی تحقیق، مرتبہ: ڈاکٹر عبدالستار دلوی، طبع اول، بمبئی، کوکل اینڈ کمپنی پبلشنگ بک سیلرس اینڈ پبلشرز، ممبئی ۱۹۷۱ء، ص ۴۲۶

۲۵: ڈاکٹر ابومحمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، ص ۱۵

۲۶: ڈاکٹر ابومحمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، ص ۲۱، ۲۲

۲۷: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان علمی نقوش، حیدر آباد، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، طبع اول ۱۹۵۷ء

۲۸: غلام رسول، اردو املا، اداریہ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد، طبع اول ۱۹۶۰ء

۲۹: گوپی چند نارنگ، املا نامہ، طبع اول ۱۹۷۴ء، دہلی، ترقیِ اردو بیورو، طبع دوم ۱۹۹۹

۳۰: رشید حسن خاں، اردو املا، طبع اول، دہلی، ہیشل اکادمی، ۱۹۷۴ء

۳۱: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو املا و رسم الخط (اصول و مسائل) طبع اول، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء

۳۲: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مرتب، اردو املا و قواعد (مسائل و مباحث) طبع اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۰ء

۳۳: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مرتب منتخب مقالات اردو املا و رموز اوقاف، طبع اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء نیز ۳۳: اعجاز راہی، مرتب، روداد سیمینار، املا و رموز اوقاف کے مسائل، طبع اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

۳۵: ابومحمد سحر، اردو املا اور اس کی اصلاح، طبع اول، بھوپال، مکتبہ اُدب، ۱۹۸۲ء

۳۶: ابومحمد سحر، اردو رسم الخط اور املا، بھوپال، مکتبۂ مالویہ، طبع اول ۱۹۹۹ء

۳۷: ڈاکٹر محمد آفتاب شاکب، اردو قواعد و املا کے بنیادی اصول، اسلام آباد، نمل، طبع اول جون ۱۹۹۴ء

۳۸: شازیہ آفتاب، اردو میں اصلاحِ املا کی کوششیں، طبع اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء

۳۹: صباح الدین احمد، املا نامہ: تجزیہ و ردِ تجزیہ، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۴۰: عقیل عباس جعفری (گمنام) طارق بن آزاد، سید عامر عالم رضوی (مدونین) صحح تلفظ، درست املا، کراچی، اردو لغت بورڈ، ۲۰۱۹ء

۴۱: ابراہیم افسر، مرتب، اردو املا: مسائل و مباحث (رشید حسن خاں کے حوالے سے) دہلی: انجمن ترقی اُردو ہند، ۲۰۲۲ء

۴۲: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، اساتی تناظر، دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۲۲ء

۴۳: سفارشات اردو املا، مرتبین ڈاکٹر رؤف پاریکھ، انجم حمید، عظمت زہرا، منظور احمد، اسلام آباد، ادارۂ فروغِ قومی زبان، طبع اول، ۲۰۲۲ء

۴۴: اردو ادب ''املا نمبر''، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) شمارہ ۲۶۷، ۲۶۹، ۲۶۸ جلد ۶۷، ۶۸ جولائی ۲۰۲۳ء تا مارچ ۲۰۲۴ء

۴۵: اعجاز راہی مرتب، املا و رموز اوقاف کے مسائل، ص ۱

۴۶: اعجاز راہی مرتب، املا و رموز اوقاف کے مسائل، ص ۱

۴۷: اعجاز راہی مرتب، املا و رموز اوقاف کے مسائل، ص ۱

۴۸: اعجاز راہی مرتب، املا و رموز اوقاف کے مسائل، ص ۲

۴۹: اعجاز راہی مرتب، املا و رموز اوقاف کے مسائل، ص ۳، ۴

۵۰: رشید حسن خاں، اردو املا کے بنیادی مسائل، مشمولہ املا نامۂ علمی، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، عارف نوشاہی، تحسین فراقی، ص ۸۹، ۹۲

۵۱: رشید حسن خاں، اردو املا کے بنیادی مسائل، مشمولہ املا نامۂ علمی، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، عارف نوشاہی، تحسین فراقی، ص ۹۱

۵۲: رشید حسن خاں، اردو املا کے بنیادی مسائل، مشمولہ املا نامۂ علمی، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، عارف نوشاہی، تحسین فراقی، ص ۱۰۴

۵۳: رشید حسن خاں، اردو املا کے بنیادی مسائل، مشمولہ املا نامۂ علمی، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، عارف نوشاہی، تحسین فراقی، ص ۱۰۷

۵۴: رشید حسن خاں، اردو املا کے چند اہم مسائل، مشمولہ اردو املا و رموز اوقاف، مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، طبع اول، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۲

۵۵: رشید حسن خاں، اردو املا کے چند اہم مسائل، مشمولہ اردو املا و رموز اوقاف، مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ص ۱۰۹، ۱۱۰

۵۶: رشید حسن خاں، اردو املا کے چند اہم مسائل، مشمولہ اردو املا و رموز اوقاف، مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ۱۱۲

۵۷: رشید حسن خاں، اردو املا کے چند اہم مسائل، مشمولہ اردو املا و رموز اوقاف، مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ۱۱۳

۵۸: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، اردو املا کے چند اہم مسائل، تحریک نفاذِ اردو کی روشنی میں، مشمولہ روداد سیمینار، املا و رموز اوقاف کے مسائل مرتبہ اعجاز راہی، ص ۱۲

۵۹: غلام رسول، اردو املا کے مسائل کا حل، مشمولہ اردو املا و قواعد (مسائل و مباحث)، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ۴۳

۶۰: مسعود حسین خاں، اردو لغت نویسی کے بعض مسائل، مشمولہ اردو لغت نویسی، (تاریخ، مسائل اور مباحث) مرتبہ رؤف پاریکھ، طبع اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء، ص ۳۲۴

۶۱: خلیق انجم، اردو املا، مسائل اور تجویزیں، مشمولہ اخبار اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جلد ۹، شمارہ ۶، جون ۱۹۸۹ء، ص ۳۰

۶۲: شان الحق حقی، زبان کے معیار کا مسئلہ، مشمولہ اخبار اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جلد ۳۲، شمارہ ۵، مئی، جون ۲۰۱۴ء، ص ۲

۶۳: شان الحق حقی، زبان کے معیار کا مسئلہ، مشمولہ اخبار اردو شمارہ ۵، ۶ مئی، جون ۲۰۱۴ء، ص ۴

۶۴: شان الحق حقی، زبان کے معیار کا مسئلہ، مشمولہ اخبار اردو، شمارہ ۵، ۶ مئی، جون ۲۰۱۴ء، ص ۵

۶۵: پروفیسر خلیل احمد صدیقی، اردو کا املائی نظام، مشمولہ روداد سیمینار، املا و رموز اوقاف کے مسائل مرتبہ اعجاز راہی، ص ۱۵۰

۶۶: پروفیسر خلیل احمد صدیقی، اردو کا املائی نظام، مشمولہ روداد سیمینار، املا و رموز اوقاف کے مسائل مرتبہ اعجاز راہی، ص ۱۵۳

۶۷: مظفر علی سید، حرف، صوت کا رشتہ، (مقالہ) مشمولہ روداد سیمینار، املا و رموز اوقاف کے مسائل مرتبہ اعجاز راہی، ص ۱۰۴

۶۸: مظفر علی سید، حرف، صوت کا رشتہ، (مقالہ) مشمولہ روداد سیمینار، املا و رموز اوقاف کے مسائل مرتبہ اعجاز راہی، ص ۱۰۵

۶۹: پروفیسر رشید امجد، حرف و صوت کا رشتہ، (بحث) مشمولہ روداد سیمینار، املا و رموز اوقاف کے مسائل مرتبہ: اعجاز راہی، ص ۱۰۹، ۱۱۰

۷۰: شان الحق حقی، زبان کے معیار کا مسئلہ، مشمولہ اخبار اردو، شمارہ ۵، ۶ مئی، جون، ۲۰۱۴ء، ص ۵

۷۱: شان الحق حقی، صحت زبان کے سلسلے، مشمولہ اخبار اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جلد ۱۸، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۲۲ء، ص ۵۷

۷۲: شان الحق حقی، صحت زبان کے سلسلے، مشمولہ اخبار اردو، جلد ۱۸، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۲۲ء، ص ۵۷

۷۳: ڈاکٹر سعید اختر درانی لفظوں کے توتے، مشمولہ اخبار اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جلد ۱۶، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۵

۷۴: شمس الرحمان فاروقی، لغات روزمرہ، اشاعتِ چہارم، کراچی، آج پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲

۷۵: شمس الرحمان فاروقی، لغات روزمرہ، ص ۱۲

۷۶: شمس الرحمان فاروقی، لغات روزمرہ، ص ۱۵

۷۷: شمس الرحمان فاروقی، لغات روزمرہ، ص ۲۱، ۲۳

۷۸: شمس الرحمان فاروقی، اردو کا ابتدائی زمانہ، ص ۱۴۷

☆☆☆☆

رمشا ملک، شعبۂ اردو، جامعہ تھل بھکر

ضلع بھکر: علمی و ادبی چراغوں کی سرزمین

ضلع بھکر، پنجاب کے جنوب مغرب میں واقع ایک تاریخی وثقافتی خطہ ہے، جو دریائے سندھ کے کنارے اپنی سادہ مگر زرخیز زمینوں اور ثقافتی ورثے کے لیے جانا جاتا ہے۔ بھکر کی سرزمین نے نہ صرف زراعت اور معاشرتی ہم آہنگی میں اہم کردار ادا کیا بلکہ علمی، ادبی اور شعری میدان میں بھی ایسے ستارے پیدا کیے جو اپنے کلام اور فکر کے ذریعے روشنی بکھیرتے رہے۔ اس علاقے نے سرائیکی اور اردو زبانوں میں ایسے شعرا، اساتذہ، محققین اور ادبی انجمنیں پیدا کیں جنھوں نے مقامی سطح سے نکل کر قومی منظرنامے پر اپنی پہچان بنائی۔

اگر ہم ضلع بھکر کے تاریخی تناظر پر بات کریں تو بھکر کی تاریخ مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی برصغیر کی عمومی تاریخ کا عکس ہے۔ مغلیہ سلطنت، سکھ راج، برطانوی حکومت اور پھر پاکستان کے قیام کے بعد، بھکر نے کئی تہذیبی وتمدنی اثرات کو جذب کیا۔ یہ ضلع تاریخی عمارات کے حوالے سے بھی اہم ہے۔ دل کشا باغ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مغلوں کا باغ تھا جو مغل بادشاہ ہمایوں نے تعمیر کروایا تھا۔ تاریخ دان ہینری ریورٹی نے اس بات سے اختلاف کیا اور کہا کہ ہمایوں کبھی یہاں آیا ہی نہیں۔ ہمایوں دوسرے بھکر گیا تھا جو صوبہ سندھ میں ہے۔ بھکر کے گرد پہلے دیواریں تھی۔ اس کے تین

دروازے تھے جن میں تاویلا، امام والا اور کنگ گیٹ شامل ہیں۔ کنگ گیٹ برطانیہ دور حکومت میں تعمیر کروایا گیا اور اس کا نام وہاں کے ڈپٹی کمشنر مسٹر خان کے نام پر رکھا گیا۔ بعد ازاں اس کا نام جناح گیٹ رکھ دیا گیا۔ شیخ راوٗ پل کے قریب بھکر کے بانی بھکر خان کا مزار موجود ہے۔ بلوچ فورٹریس کی جگہ اب پولیس اسٹیشن ہے۔ قلعہ منکیرہ بھی اسی ضلع میں ہے، ۱۹۸۱ء میں اسے میانوالی سے الگ کر کے ضلع کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ یہاں کے قدیم قلعے، دربار، مساجد اور کتب خانے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ خطہ صرف زراعت نہیں بلکہ علم وادب کا مرکز بھی رہا ہے۔

ضلع بھکر کا ادبی سفر اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سرائیکی زبان کے دوہے، کافی اور لوک شاعری

مضمون نگار

بھکر کی ادبی دنیا میں خواتین کی شرکت بھی قابلِ ذکر ہے، وہ اپنے جذبات، نسوانی احساسات، سماجی ناانصافیوں اور روحانیت جیسے موضوعات پر موثر آواز اٹھا رہی ہیں

عام بول چال کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد اردو زبان کی آمد اور فروغ کے ساتھ ساتھ یہاں کی ادبی فضا نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ آج بھکر کی مختلف تحصیلوں میں سینکڑوں شعرا، نثر نگار، نقاد اور ادیب موجود ہیں، جو نہ صرف اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشرتی شعور بیدار کر رہے ہیں بلکہ علاقائی زبان وادب کے تحفظ اور ترویج میں بھی کوشاں ہیں۔

ضلع بھکر کی سرائیکی ادب میں خدمات قابلِ فخر ہیں۔ سرائیکی زبان بھکر کی تہذیبی شناخت ہے۔ یہاں کے کئی شعراء نے سرائیکی زبان میں غزل، کافی، دوہڑا اور نظم جیسی اصناف میں قابل ذکر تخلیقات پیش کی ہیں۔ ان شعرا نے عشق، تصوف، فقر، دیہی زندگی، معاشرتی مسائل اور انسانی جذبات جیسے موضوعات کو نہایت سادگی مگر گہرائی کے ساتھ پیش کیا۔

ضلع بھکر کے معروف شعرا میں شامل ہیں:

ملک سونا خان بے وس (ڈلے والا): جنھوں نے سرائیکی غزل و دوہڑے میں غم و عشق کو بڑے دل نشیں انداز میں پیش کیا۔ ان کی شاعری نے سرائیکی زبان کے معروف لوک گلوکار عطا اللہ خان عیسیٰ خیلوی کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

''کر ظلم دی بارش پیار اُتے'' ۱۹۷۴ء میں طارق عزیز شو جو اس وقت ''نیلام گھر'' کے نام سے مشہور تھا اس میں گایا۔ لالہ جی نے بابا جانی کا پہلا گیت ''روندیاں نیں جگ وچ اکھیاں نیمانڑیاں'' گایا۔ عطاء اللہ خان نیازی اور سونا خان بے وس کی محبت آج تک قائم ودائم ہے۔ لالہ جی نے بابا جانی کا اب تک کا آخری کلام خواجہ غلام فریدؒ کی کافی ''دلڑی لٹی تیئں یار سجنڑ'' میں ہر انترے کے ساتھ دوہڑہ گایا ہے۔ ان کے ۴۸۷ دوہڑے اور ۸۲ گیت اور غزلیں لالہ نے گائے ہیں اور ہر گیت ایک شاہکار گیت بنا جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

ای بے کسی دا تماشا بنڑا کے
میکوں اپنڑی لٹی زندگی دامیں ارمان
میڈا سوہنڑا ڈھولا کجھ تاں ڈساویں ھا
کیوں تڑپیندا ئیں ڈس ہئی ایماناں
بیدرد سجنڑ کوں ھر ویلے
تیکوں اپنڑا عہدِ وفا یاد ھوسی
آمیڈے دل دی لٹی دنیا کوں جلدا
دلاں دے تاجرا و دنیا والو
قسمت چنگی جو نا ھی
ڈیکھو عروج والو
لُٹ پُٹ کے سکھ چین ڈکھی دا
انداز اوپرے ھن
برگِ حنا تے دل ول کے ناں
تیڈے کول حسرتاں دی بارات
ناکام کہانی الفت دی
توں خوش وس تیڈا وطن وسے
مختار غریب دی زندگی دا

رات ڈینہاں پچھتاندی پئی آں
میڈی ہر خوشی دا قاتل
جو گزریاں واہ واہ گذر گئیاں
اے نئیں سوچا ساڈی غربت
دغاباز سنڑ دی ھامی
میڈی محبت میڈی وفا کوں
تیڈے پیار دی ابتدا منگد اراھنداں
اساں رج کے بدنصیب ہاں

جیسے لازوال شاہکار شامل ہیں۔

نذیر احمد نذیر ڈھالہ خیلوی (منکیرہ): جنھوں نے کلاسیکی انداز میں زبان و بیان کو نئی وسعتیں دیں۔

عصمت گرمانی (کلورکوٹ): جن کا جدید سرائیکی نظم میں الگ لہجہ نمایاں ہے۔

صدیق بشیر (ضلع بھکر): جو سرائیکی تنقید اور تحقیق میں مستند مقام رکھتے ہیں۔

ضلع بھکر کا اردو ادب میں مقام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

اردو زبان نے ضلع بھکر میں تعلیم و تدریس کے ذریعے جڑیں مضبوط کیں۔ مقامی شعرا نے اردو غزل، نظم، رباعی اور نثر میں اپنے قلم کا لوہا منوایا۔ ان کی شاعری میں دیہی زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ ساتھ ایک نیا فکری شعور بھی جھلکتا ہے۔

چند نمایاں شخصیات کا ذکر ذیل میں ہے:

قاضی فتح محمد فتح (بھکر): کلاسیکی اردو غزل کے شاعر جن کے کلام میں مذہبی و اخلاقی پہلو نمایاں ہیں۔ جن کی شاعری رومانی اور فکری جہت رکھتی ہے۔

اسد جعفری (دریاخان): اردو نثر و شاعری دونوں میں یکساں مہارت رکھنے والے شاعر ہیں۔ اسد جعفری نے ادبی مجالس اور محافل میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ انھوں نے نوجوان شعراء کی رہنمائی کی اور اردو ادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی تصانیف میں

شاعری کے مجموعے اور خود نوشت شامل ہیں۔ ان کی کتابوں کو اردو ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ اسد جعفری کی ادبی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کی شاعری اور تحریریں اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

فرخ شہزاد (منکیرہ): جدید طرزِ اظہار میں گہرے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

عباس (کلورکوٹ): جن کی شاعری فلسفیانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔

بھکر کی ادبی دنیا میں خواتین کی شرکت بھی قابل ذکر ہے۔ وہ اپنے جذبات، نسوانی احساسات، سماجی ناانصافیوں اور روحانیت جیسے موضوعات پر موثر آواز اٹھا رہی ہیں۔

فرحت پروین (بھکر): نعتیہ شاعری میں اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''منجمد (۱۹۹۷ء) ریستوران کی کھڑکی سے''، ''کانچ کی چٹان''، ''صندل کا جنگل'' ''بزمِ شیشہ گراں'' اس کے علاوہ ''گفتم'' (نظموں کا مجموعہ) اور ''خوابِ زمستاں'' (عالمی ادب سے تراجم)۔ ''دی گور'' (لوئس لوری کے سائنس فکشن ناول کا ترجمہ) بھی شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مزید ایک افسانوں کا مجموعہ اور غزلوں کا مجموعہ زیرِ طباعت ہے۔ انھوں نے بیرون ملک قیام کے دوران ادبی محافل کا انعقاد کیا اور پاکستان اور ہندوستان کے اہل قلم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ انھیں ساحر لدھیانوی ٹرسٹ کی جانب سے ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا ہے اور ادارہ بیاض نے انھیں بہترین افسانہ نگار کا اعزاز دیا ہے۔ ان کی شاعری کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

تمھیں آزاد کرتی ہوں
سنو کوئی عذر مت
ڈھونڈو نہ ہی نظریں
چراؤتم
مجھے معلوم ہے میں سب سمجھتی ہوں
تمھارے عہدِ الفت سے تمھیں آزاد کرتی ہوں

اب ایسا ہے کہ پتھر کا زمانہ پھر سے لوٹ آیا
وہی قانون جنگل کا جبلت کا غلام انساں
فرازِ عشق سے پاتال تک کا ہے سفر یعنی
فراق و ہجر کے موسم ہوئے پارینہ قصے اب
بہ کثرت ہیں میسر اب تو معشوقانِ شیریں لب
میں ہوں حیرت زدہ اب تک
وہ کیسے لوگ تھے آخر
لہو سے کر گئے رنگین جو الفت کے قصوں کو
عجب ہی رہ نکالی تھی
وفا کی رسم ڈالی تھی
میں قصہ گو ابھی تک داستانوں میں ہی رہتی ہوں
وہی رسمیں نبھاتی ہوں وہی دکھ درد سہتی ہوں
مگر میں عہدِ حاضر کے رویوں سے بھی واقف ہوں
سنو کوئی عذر مت ڈھونڈو نہ ہی نظریں چراؤتم
مجھے معلوم ہے میں سب سمجھتی ہوں
تمھارے عہدِ الفت سے تمھیں آزاد کرتی

رخسانہ قمر (دریاخان): اردو و سرائیکی دونوں زبانوں میں جذباتی اور نسائی شعری اظہار کی حامل ہیں۔

ضلع بھکر میں کئی ادبی انجمنیں فعال ہیں، جنھوں نے شعری نشستوں، مشاعروں، کتاب میلوں اور تخلیقی ورکشاپس کے ذریعے ادبی سرگرمیوں کو پروان چڑھایا ہے:

بزمِ سخن بھکر
سرائیکی ادبی سنگت بھکر
ادبی بیٹھک دریاخان
بزمِ علم و ادب کلورکوٹ

یہ ادارے نہ صرف نئے لکھاریوں کی تربیت کا ذریعہ ہیں بلکہ بزرگ شعرا اور ادیبوں کے تجربات کو نئی نسل تک منتقل کرنے میں بھی پل کا کردار ادا کرتے ہیں۔

بھکر کا تعلیمی نظام بھی رفتہ رفتہ ترقی کی جانب گامزن رہا۔ تھل یونیورسٹی بھکر، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بھکر، گورنمنٹ کالج برائے خواتین اور مختلف پرائیویٹ ادارے تعلیم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہاں سے فارغ التحصیل کئی افراد نہ صرف ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی تدریسی و تحقیقی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

بھکر کی سرزمین پر نئی نسل کے ابھرتے بہت ہی عمدہ لب و لہجے کے باکمال شعرا میں:

شعیب صدیقی (پنجگرائیں)
افکار علوی (گوہروالا)
نوشیروان اسفند نوشی (گوہروالا)
عبداللہ زرین (ڈیلی کراس)
عارف بخاری (بھکر)

اقبال حسین خان (بھکر)
کاظم حسین کاظم (دریا خان)
وغیرہ کے نام سرفہرست آتے ہیں
کاظم حسین کاظم کی شاعری سے کچھ اشعار

رخ اپنی تمناؤں کا اب موڑ رہا ہوں
اک ٹوٹے ہوئے شخص کو میں جوڑ رہا ہوں
منزل کا تعین ہے نہ سانسوں کا بھروسہ
میں وقت کی تقلید میں بس دوڑ رہا ہوں
میں اوروں کے حصے کے بھی دم پھونک نہ جاؤں
یہ سوچ کے جلدی سے میں دم توڑ رہا ہوں
جس سحر نے توڑا ہے مجھے حال میں آ کر
ماضی میں اسی سحر کا میں توڑ رہا ہوں
انسان کی تکمیل ہے رہ جانا ادھورا
کچھ کام ادھورے میں بھی چھوڑ رہا ہوں
جس شاخ کو چھونے سے ہوا خلد سے باہر
میں آج بھی اس شاخ سے پھل توڑ رہا ہوں
اک غم سے ہے اشکوں کے تعلق کی وضاحت
میں اشک سے پتھر کو اگر توڑ رہا ہوں
جدت کا تقاضہ ہے الٹ بات تو کاظم
دیوار کو میں سر سے میاں پھوڑ رہا ہوں

بھکر کے شعرا اور ادبا کا کلام اب صرف مشاعروں یا کتابوں تک محدود نہیں بلکہ ریختہ، اردو پوائنٹ، اور دیگر ویب سائٹس کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر بھی پڑھا جا رہا ہے۔ کچھ شعرا نے اپنی ذاتی ویب سائٹس یا سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر بھی اپنے کلام کو پیش کرنا شروع کیا ہے، جس سے ان کا دائرہ اثر وسیع ہو رہا ہے۔

ضلع بھکر اپنی تمام تر سادگی، دیہی رنگ، اور تہذیبی ورثے کے باوجود ایک ایسا ادبی مرکز بنتا جا رہا ہے جہاں کلاسیکی و جدید اصناف، سرائیکی و اردو زبان، اور مرد و خواتین شعرا سب یکساں طور پر جلوہ گر ہیں۔ یہ علاقہ اپنی علمی و ادبی خدمات کی بدولت قومی نقشے پر ایک مستند پہچان بنا چکا ہے۔

آنے والے وقتوں میں اگر حکومت، مقامی تنظیمیں، اور تعلیمی ادارے مل کر اس ادبی ورثے کو محفوظ کرنے اور فروغ دینے میں کردار ادا کریں، تو بھکر کا نام ادب کے افق پر مزید روشن ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆

فیصل شہزاد تونگر، شعبۂ اُردو، جامعہ تھل، بھکر

شعیب صدیقی کی اُردو شاعری

جدید لب و لہجے اور نازک احساسات کا شاعر شعیب صدیقی تھل کی دھرتی کا درخشاں چراغ۔ تاریخ گواہ ہے کہ بھکر، جسے دشتِ تھل کا علمی و ادبی نگینہ کہا جاتا ہے، ہمیشہ فکر و دانش کا مرکز رہا ہے۔ اس خطے کو اگر ''تھل کا لکھنؤ'' کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بھکر کی زرخیز مٹی نے وہ نامور اصحابِ قلم پیدا کیے جنھوں نے نہ صرف مقامی بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنا لوہا منوایا۔ اثر ترمذی، شاد بخاری، حیا رام پوری، شکیب جلالی، باقر بخاری، خلش صہبائی جیسے شعرا نے اس خطے کی علمی فضا کو معطر کیا اور بھکر کی ادبی تاریخ کو امر کر دیا۔

اسی سرزمین سے تعلق رکھنے والا ایک اور تابندہ نام نئی نسل کا حساس شاعر شعیب صدیقی ہے، جس کی شاعری میں جذبات کی لطافت اور اظہار کی تازگی اپنے پورے جوبن پر دکھائی دیتی ہے۔

یہ وہ شعر ہے جس نے شعیب کو کم عمری میں ہی شعری افق پر نمایاں کر دیا۔ ان کی شاعری نے اتنی کم مدت میں جو مقبولیت اور پذیرائی حاصل کی ہے، وہ معمولی بات نہیں۔ کم عمری میں اتنا پختہ اسلوب اور فکر کی گہرائی کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ شعیب صدیقی ضلع بھکر کی تحصیل دریا خان کے نواحی قصبے پنجترائیں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تدریس ان کا پیشہ ہے، لیکن شاعری ان کی پہچان۔ وہ ملک کے کم عمر ترین پی ایچ ڈی اسکالرز میں شامل ہیں جنھوں نے قرطبہ یونیورسٹی سے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔ طالب علمی کے دور سے ہی شعری ذوق ان کی طبیعت کا حصہ بن چکا تھا۔ اقبالیات اور دیگر فکری موضوعات پر ان کے مضامین اور کالم وقتاً فوقتاً مظرِ عام پر آتے رہتے ہیں لیکن بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہی ہے۔ شعیب صدیقی کی شاعری میں ایک مخصوص تازگی، انفرادیت اور اثر پذیری نمایاں ہے۔ ان کی تخلیقات کو دیکھ کر اکثر لوگ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ اشعار اتنے کم عمر شاعر کے قلم سے کیسے نکل سکتے ہیں۔ بعض اوقات ان کے اشعار کو جون ایلیا جیسے عظیم شاعر کے نام سے منسوب کر دیا جاتا ہے کیونکہ شعیب کی شاعری میں جون ایلیا کی بازگشت اور لہجے کی جھلک واضح محسوس کی جا سکتی ہے۔

شعیب صدیقی کے کچھ اشعار

''تم میری تصویر بنا کر لائی ہو
یعنی میں دیوار سے لگنے والا ہوں''

اس شعر کو کئی حلقوں میں جون ایلیا کے کلام کا حصہ سمجھا گیا کیونکہ الفاظ کی چاشنی لہجے کی کاٹ اور اندازِ بیان میں ایک مماثلت پائی جاتی ہے۔ شعیب کی غزلیں جذبات کی ایسی آئینہ دار ہیں کہ قاری خود کو ان میں ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شاعری ہمیشہ حساس دل و دماغ کی پیداوار ہوتی ہے اور شعیب صدیقی کی شاعری اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کے اشعار میں انسانی جذبات، محبت، جدائی زندگی کی تلخ حقیقتیں اور معاشرتی پہلو اس قدر خوبصورتی سے سمٹ آتے ہیں کہ پڑھنے والا تادیر ان کے اثر میں رہتا ہے۔ ادب کی دنیا میں ایسے شاعر کم ہی ملتے ہیں جو روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہوتے ہیں۔ شعیب کی غزلوں میں روایت کی چاشنی اور جدت کی تازگی دونوں جلوہ گر ہیں۔ ان کے یہاں استعاروں، تشبیہوں، علامتوں

اور عروضی حسن کا ایسا امتزاج ہے جو اردو غزل کی آبرو کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں جدید لب ولہجہ اور عصرِ حاضر کے مسائل کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ سہل ممتنع میں کہے گئے اشعار چھوٹی بحروں میں بڑی باتیں اور سادہ الفاظ میں گہری معنویت ان کے کلام کی خاص پہچان بن چکی ہے۔ ان کے متعدد اشعار عوامی زبان پر رواں دواں ہیں۔ جن میں فکری گہرائی اور جذبات کی شدت ایک ساتھ نظر آتی ہے۔

شعیب صدیقی کی تخلیقات کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ہر شعر آئینے کے سامنے بیٹھ کر لکھا گیا ہو۔ ان کے اشعار میں لطافت، سادگی، ندرتِ خیال اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں ہے۔ یہی انفرادیت انھیں دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

چند منتخب اشعار:

جسم اگر ہوتا تو جیت بھی لیتا میں
وہ مجھ پر کیفیت بن کے طاری ہے

☆

یعنی حائل میں بھی ہو سکتا تھا بیچ ہمارے
اونچی تھی جو بالآخر دیوار گرا دی میں نے

☆

ڈالتا ہوں میں ریت کمرے میں
گھر کو مجنوں کا گھر بناتا ہوں
میں تجھے بھولنے کی کوشش میں
سانس لینا بھی بھول جاتا ہوں

ان اشعار میں شعیب کی تخلیقی مہارت اور جذبات کی شدت کھل کر سامنے آتی ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کی وسعت بھی دکھائی دیتی ہے، جس میں محبت، تنہائی، خودشناسی، سماجی تضادات اور زندگی کے بے شمار پہلو سموئے گئے ہیں۔

شعیب صدیقی کی شاعری بھکر کے ادبی منظرنامے کو نئی روح بخش رہی ہے۔ اس خطے کی علمی سرزمین میں شعیب نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ایک نیا رنگ بھر دیا ہے۔ وہ محض شاعری برائے تفریح نہیں کرتے، بلکہ ان کی تخلیقات میں فکری سنجیدگی، جذبات کی صداقت اور انسانی احساسات کی گہرائی نمایاں ہے۔

شعیب کی طبیعت میں موجود حساسیت ان کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ ان کا اندازِ سخن، منفرد طرزِ بیان اور جدتِ خیال اردو ادب کو ایک نیا زاویہ عطا کر رہے ہیں۔ ان کی گفتگو، اخلاق اور عاجزی ان کی شخصیت کا حسین عکس ہے جو ایک فن کار میں ہونا چاہیے۔

خدا شعیب صدیقی کو سلامت رکھے، ان کے قلم کو مزید توانائی اور ان کی شاعری کو نئی بلندی عطا کرے۔ دعا ہے کہ ان کی تخلیقات ہمیشہ قاری کے دل میں اترتی رہیں اور بھکر کی علمی سرزمین ان کے جیسے مزید ہنرمند پیدا کرتی رہے۔

چند مزید اشعار:

جب چلے گی ہوا تو پھیلے گی
چار سمتوں میں پیار کی خوشبو
ابھی کچھ دن گزارو میرے دل میں
مکاں فی الحال ویسے بھی خالی ہے
مجھے اب ڈھونڈنا کارِ عبث ہے
خدا جانے میں کب سے لاپتا ہوں
زمین گردش میں ہے اور اس کے اوپر
میں اک مرکز پہ گردش کر رہا ہوں
ہم نہ ہوں گے تو ہوگا کچھ بھی نہیں
جیسے ہونے سے کچھ نہیں ہوگا

☆☆☆☆

خطباتِ بابائے اُردو مولوی عبدالحق

”ہر زمانے میں انسانی زندگی اور تہذیب وتمدن کی ترقی میں زبان نے بڑا کام کیا ہے بلکہ بہت کچھ اسی پر دارومدار رہا ہے۔“

O

”زبان اور ادب جن میں سے خیالات ڈھل کر نکلتے ہیں دماغی اور ذہنی تہذیب وتربیت کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

O

”زبان کے علم اور مطالعے نے قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ملانے میں بڑا کام کیا ہے۔“

O

”قومی اتحاد کے مستحکم کرنے اور قوموں کے بنانے میں زبان کا بھی حصہ ہے۔“

O

”جب کسی قوم نے کسی دوسری قوم کو فتح کیا اور اپنی زبان زبردستی مفتوح قوم کے سر منڈھ دی تو جب بھی اُس کا بس چلا، اُس نے فاتح کی زبان کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔“

O

”اگر (کوئی) زبان زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی اور حالاتِ زمانہ کے مطابق انسانی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی تو (وہ) ایک مقامی بولی ہوگی اور ملک کی مستند زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔“

”خطباتِ عبدالحق“ (ایڈیشن ۱۹۵۲ء اور ۱۹۷۴ء) سے اخذ کردہ، یہ ”انتخاب“ ہمارے لیے ایک مستقل سرمایہ فکر ہے۔ زبان کیا ہے؟ زبان کی قوت اور طاقت، زبان اور انسان کے تعلق، زبان کے بننے کے عمل، زبان اور زندگی کے تعلق، زبان اور ذہنیت کے ربط، انسانی ذہن کے ارتقا میں زبان کے کردار، زبان کی ہمہ جہتی افادیت، اہمیت، فضیلت، زبان اور خیال کی یک رنگی..... قومی، انسانی اور مملکتی اتحاد اور یگانگت میں زبان کے مؤثر اور بنیادی دخل کے بارے میں مولوی عبدالحق کے یہ ”فرمودات“ کل بھی ہمارے لیے چراغِ راہ تھے..... مولوی عبدالحق کا یہ ”دردمندانہ کلام“ آج بھی ہمارے لیے نورِ بصیرت کی حیثیت رکھتا ہے..... آنے والے وقتوں میں اس کی اہمیت مزید بڑھے گی اور ہمارے لیے مستقل لائحہ عمل اور سرچشمۂ نور کی حیثیت سے یہ ایک فروزاں اور مستحکم منزلِ مقصود کا پتا دیتی رہے گی۔

(انتخاب: سیّد روح الامین)

تبصرۂ کتب

تبصرہ کتب کے سلسلے میں اردو زبان وادب اور لسانیات کے حوالے سے شائع شدہ کتابوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ازراہ کرم تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے ارسال فرمائیے۔

آدھی گواہی

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نسیم خان نسیما مبصر: جبار مرزا

پروفیسر ڈاکٹر نسیم خان نسیما فیصل آباد میں ہوتی ہیں، شاعرہ، محقق، مؤرخ اور مصنف بھی ہیں۔ ان کے شاعری کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آدھی گواہی'' حال ہی میں شائع ہوا ہے، نعت اور حمد کے الگ الگ مجموعے ہیں۔ پروفیسر سیما کا ایمان افروز ادبی ورثہ ہے، مشاہیر پاکستان ادبی، دھرمی سائنسی اور ملی ادبی تحقیقی کام ہے، پروفیسر ڈاکٹر نسیم خان نسیما اب تک کی عمر کا بڑا حصہ پڑھنے پر لگا چکی ہیں، پھر کتابیں لکھتی رہی ہیں اور اب کچھ عرصے سے پڑھا رہی ہیں وہ یونیورسٹی استاد ہیں، پروفیسر ڈاکٹر نسیم خان نسیما کے ''پی ایچ ڈی'' کے مقالے کا عنوان ہے، ''اردو شاعری کے مزاحیہ کرداروں کا تنقیدی جائزہ''، زیر نظر کتاب میں وہ مقالہ شامل ہے۔

۲۲ لوگ

مصنف: سجاد پرویز تبصرہ: شاہانہ جاوید

اردو ادب میں ایک نئی صنف تیزی سے مقبول ہو رہی ہے ''مصاحبہ''، بہت سے لوگ اس نئے لفظ سے واقف نہ ہوں لیکن انٹرویو لفظ کو اچھی طرح پہچانتے ہوں گے۔ اردو ادب میں انٹرویوز کی روایت کتنی پرانی ہے معلوم نہیں لیکن آج کے دور میں یہ صنف ادب، مصاحبہ تیزی سے مقبول ہو رہی ہے۔ بہت سے لکھنے والے اسے فروغ دے رہے ہیں آج یہ ایک مقبول صنف بن چکی ہے۔ سجاد پرویز صاحب کی کتاب ''۲۲ لوگ'' اس صنف میں ایک شاندار اضافہ ہے۔

آج کے اس نفسا نفسی کے دور میں جہاں شارٹ کٹ کا رواج ہے وہاں کوئی اتنے پیار سے اتنے اہتمام سے اپنی کتاب چھپوائے گا سوچا ہی جا سکتا ہے لیکن جس وقت آپ کے ہاتھ میں کتاب ''۲۲ لوگ'' ہو گی تو آپ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ کیا خوبصورت کتاب ہے، کچھ دیر کو نظریں ٹائٹل پر ہی جم جائیں گی، سیاہ رنگ میں سنہری بیل بوٹے کناروں پر اور اردو کی گنتی میں بائیس لوگ اور کونے میں سجاد پرویز کا نام جگمگا رہا ہے بالکل اس طرح جیسے اندھیری رات میں بائیس روشن ستارے، بائیس نابغہ روزگار شخصیات جن کا تعلق ادب وفن سے ہے اس اندھیرے معاشرے میں جگمگا رہے ہیں۔ کتاب کو صاحب مصاحبہ کی رنگین تصاویر سے مزین کیا گیا ہے ساتھ ہی اس شخصیت کا بھرپور تعارف بھی لکھا ہے۔ کتاب ہاتھ میں لیتے ہی کتاب کی خوبصورتی اجاگر ہو جاتی ہے، بہترین کاغذ پر الفاظ موتیوں کی صورت سجائے گئے ہیں، مجھے سب سے یاد ذرا زرا۔ کی صورت اپنا تعارف بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔

سجاد پرویز کا شمار ریڈیو پاکستان کے سینئر براڈ کاسٹرز میں ہوتا ہے۔ آپ اپنے مہمان سے مکالمہ کرتے ہیں اور اس گفتگو کو آواز کی لہروں پر ہم تک پہنچاتے ہیں یہ ایک طویل داستان ہے۔ سجاد پرویز کو مطالعہ اور شعر و ادب میراث میں ملا ہے، انھوں نے اس میراث میں ایک نئی صنف پر کام کر کے گراں قدر اضافہ فرمایا ہے۔ آپ نے پہلا انٹرویو اے حمید صاحب کا، لاہور میں مختصر قیام کے دوران ریکارڈ کر کے بہاول پور لائے، قسمت نے یاوری کی اور حسن درانی نے یہ انٹرویو ادبی پروگرام میں نشر کر دیا۔

اس وقت یہ ایک بڑی بات تھی، اے حمید ایک جانے پہچانے ادیب و کالم نگار تھے یوں انٹرویو لینے کا سلسلہ چل نکلا، اے حمید کے انٹرویو سے اس کتاب کے پہلے انٹرویو کی بنیاد پڑی۔ انہی دنوں بہاول پور آنے والی مشہور شخصیات نصرت فتح علی، پٹھانے خان، عبداللہ حسین، ضیاء محی الدین اور میکسم کے انٹرویو کیے، جو بہاول پور کے رسالے ''حقیقت'' میں شائع بھی ہوئے۔

آپ نے جن دوسری شخصیات کے انٹرویوز کیے ان میں انتظار حسین، ڈاکٹر آصف فرخی، امین گل جی، افتخار عارف، رضا علی عابدی، زاہدہ حنا، زہرا نگاہ، شکیل عادل زادہ، عقیل عباس جعفری، فہمیدہ ریاض، وجاہت مسعود وغیرہ شامل ہیں۔

سجاد پرویز نے انٹرویو سے پہلے انٹرویو دینے والی شخصیت کا جامع اور خوبصورت تعارف پیش کیا ہے جس کی وجہ سے انٹرویو پڑھ کر شخصیت کا سارا پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔ آپ نے جس شخصیت سے بھی انٹرویو لیا ان کی شخصیت کے ہر پہلو پر کھل کر شائستہ انداز میں گفتگو کی ہے اور اس کی شخصیت کو بھرپور انداز میں سامنے لائے ہیں یعنی یہ کتاب معلومات کا خزانہ ہے اور علم و تحقیق کے میدان میں ایک سنگ میل ہے، ان شخصیات کو ان مکالموں کی صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔

رضا علی عابدی صاحب فرماتے ہیں ''کہ سجاد پرویز کو یہ انٹرویوز ریکارڈ کرتے ہوئے شاید خیال بھی نا ہو گا کہ وہ ایک صدی کے اواخر اور ایک صدی کے اوائل سے وابستہ سرکردہ افراد کے احوال اور افکار کو محفوظ کر رہے ہیں'' ایک جگہ فرمایا ''مصنف نہیں رہتا تصنیف رہ جاتی ہے''۔ عرفان صدیقی نے اپنے خیالات یوں بیان کیے ہیں ''انٹرویو میں بعض اوقات جواب سے زیادہ اہمیت سوال کی ہوتی ہے، سجاد صاحب کے ان انٹرویوز کی اہمیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اتنے موزوں سوالات کیے ہیں جنھوں نے نہ صرف ان کی اپنی علمی وقعت ظاہر کی بلکہ مخاطب سے بھی شعور افزا جوابات حاصل کیے''۔ دوسری

بڑی شخصیات نے بھی اس کتاب پر اظہار خیال کیا ہے۔

اس کتاب کو ہر اس کتب خانے کی زینت بننا چاہیے جو کتب کے قدر دان ہیں، یہ کتاب آگے چل کر نئے لکھنے پڑھنے کے لیے تحقیق کے در وا کرے گی۔ اس کتاب کی پیش کش میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا کردار قابل تعریف ہے۔ حرف آخر ''مصاحبہ'' کی یہ کتاب اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے اور اس صنف کے پڑھنے والوں کے لیے نایاب تحفہ۔

سہیل وڑائچ کہانی

مصنف: پیر محمد ضیاالحق نقشبندی تبصرہ: ڈاکٹر عارف حسین

سہیل وڑائچ کہانی، پیر محمد ضیاالحق نقشبندی کی کتاب جناب سہیل وڑائچ کے بارے میں ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ایک جامع اور خوبصورت کتاب ہے جسے ضیا القرآن پبلی کیشنز، لاہور نے ستمبر ۲۰۲۳ء میں بڑے خوبصورت اور دیدہ زیب انداز میں شائع کیا ہے۔ فہرست عنوانات پر ایک نظر ڈالی جائے تو (۹) بڑے عنوانات کے تحت جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔ پہلے حصے میں سفر زندگی (سہیل وڑائچ) کے تحت ان کے خاندانی پس منظر (والد، والدہ)، بچپن (ابتدائی زندگی/لڑکپن)، دوسرا عنوان تعلیمی سفر کے تحت منتخب کیا گیا ہے جس میں زندگی کی شروعات کے حوالے سے ابتدائی سکول، کالج کے تجربات، یونیورسٹی کا سحر جبکہ تیسرا عنوان جناب سہیل وڑائچ کی ذاتی زندگی، زندگی کے مختلف رنگوں کے حوالے سے قائم کیا گیا ہے جس میں ان کی شادی اولاد بیٹا (رحمت)، زندگی کے مختلف رنگ، عید کے تہوار، اندر کی اُداسی اور ان کی کتابوں سے دلچسپی کے بارے میں ہے۔ چوتھے حصے میں ان کے صحافتی سفر کا بیان کیا گیا ہے۔ جس میں صحافت کا آغاز، روزنامہ جنگ (مختلف ادوار)، جنگ (بحران کے دور)، دیگر صحافتی ادارے، رپورٹنگ، صحافتی انٹرویوز، جیو ٹی وی سے وابستگی اور کالم نگاری کے سلسلے میں تفصیلی مواد مہیا کیا گیا ہے۔ پانچویں حصے میں نامور سیاست دانوں کے بارے میں تفصیلی بحث اور معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ جن میں ن لیگ کے صدر میاں محمد نواز شریف (کبھی ناراض کبھی خوش)، پی پی کی چیئر پرسن محترمہ بے نظیر بھٹو، بی بی کی شہادت، آصف علی زرداری (دلچسپ ملاقاتیں)، نوابزادہ نصراللہ خان (پسندیدہ سیاسی شخصیت)، الطاف حسین اور ایم کیو ایم اور ایک دلچسپ اور مزاحیہ کہانی چودھری سچ کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ چھٹا حصہ جمہوریت کے حوالے سے قلمبند کیا گیا ہے جس میں جمہوریت (مسائل، خطرات، تدابیر)، کرپشن کلچر، بیرون ملک اثاثے، سیاسی جماعتیں (ن لیگ، تحریک انصاف اور دینی جماعتیں)، ساتویں حصے میں ۲۰۱۸ء کے عام انتخابات کے ذیل میں بحث کرتے ہوئے پچھلے عام انتخابات (شفاف یا دھاندلی)، عمران خان کو چلنے دیں، کیا حکومت مدت پوری کر پائے گی؟، پنجاب کی سیاست اور عمران خان کامیاب نہ ہوئے تو؟ کتاب کا آٹھواں حصہ مختلف ایشوز پر آرا کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے، جس میں ڈکٹیشن کا حق، بنگلہ دیش ماڈل، چین یا امریکہ، کشمیر اور افغانستان، جسٹس مارشل بنام فاضل جج صاحبان، رحمٰن ملک، اہلِ مصلحت کے نام، اسحاق ڈار، اچھا کپتان اور بُرا منیجر، کامیاب سیاست، کمزور معیشت، زبان بندی چل نہیں سکتی، آئین ہی واحد راستہ ہے اور جمہوریت کے خلاف سازش وغیرہ کے ضمن میں تفصیلات ملتی ہیں۔ کتاب کا نواں اور آخری عنوان سہیل وڑائچ کے چند منتخب کالموں کے مجموعوں سے منتخب کیا گیا ہے اور اس میں ان کے شہرہ آفاق کالم جن میں جنرل حمید گل کا خط عالم بالا سے، دو چہرے، سیاست کریں مگر اصلاحات بھی لے آئیں، سرو اور گھاس، تاریخ کا مقدمہ بنام محمود اچکزئی، مجھے کورونا ہو گیا، بے بے جی، جہانگیر بدر بھولے تھے، ابنِ بطوطہ دوم کا سفر نامہ، ابنِ بطوطہ دوم کا سفر، میانداد کا راستہ، میں مولوی مصلّی ہوں، جب بادشاہ قید ہوا اور ہمارے ہیرو بوڑھے کیوں ہیں؟

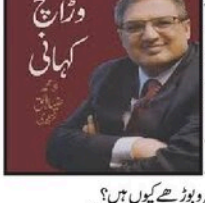

مذکورہ کتاب میں سہیل وڑائچ کے بچپن سے لے کر اب تک کی کہانی بڑے خوبصورت اور دلنشیں انداز میں بیان کی گئی ہے، جس میں ان کی زندگی کے تمام دلچسپ پہلو، واقعات اور ان کے زندگی کے اتار چڑھاؤ کو ایک تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قارئین اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو یقیناً پیر محمد ضیاالحق نقشبندی کو داد دیں گے کہ انھوں نے سلیقے اور محنت سے کتاب کو مرتب کرنے میں نہایت محنت اور سلیقہ شعاری سے کام کیا ہے۔

ماہنامہ ''الحق''

یہ رسالہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلّہ ہے جس میں دارالعلوم حقانیہ اور دینی مسائل سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں۔ مولانا راشد الحق سمیع مدیر اعلیٰ اور مولانا محمد اسلام حقانی اور مولانا سید حبیب اللہ شاہ اس کے نائب مدیران ہیں۔ یہ رسالہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، ضلع نوشہرہ (خیبر پختونخوا) پاکستان سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پبلشر: مولانا راشد الحق سمیع، جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، منظور عام پریس پشاور۔

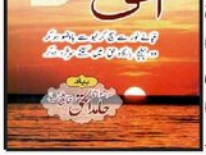

مخزن

قائداعظم لائبریری کا ادبی مجلّہ دورِ جدید مخزن لاہور کا جشنِ سیمین نمبر مدیرہ ڈاکٹر بصیرہ عنبریں کی ادارت میں شائع ہوگیا ہے۔ اس رسالے کا حصہ اول: انتخاب ''مخزن''

دورِ قدیم مضامین، تراجم، شاعری: منظومات و غزلیات، حصہ دوم اشاریہ ''مخزن'' دورِ جدید جبکہ حصہ سوم: تبصروں پر مشتمل ہے۔

☆☆☆☆

ادارۂ فروغِ قومی زبان میں ای آفس کی تربیتی ورکشاپ کے موقع پر ڈائریکٹر جنرل، پروفیسر محمد سلیم مظہر، ایگزیکٹو ڈائریکٹر ڈاکٹر راشد حمید، ڈپٹی ڈائریکٹر محبوب بگٹی، ڈاکٹر عارف حسین، کامران مشتاق، چیف آئی بورڈ کے منیجر سید طاہر عباس و دیگر ملازمین ادارہ

ادارۂ فروغِ قومی زبان میں ای آفس کے استعمال سے متعلق تربیتی سیشن کا انعقاد

اسلام آباد۔ وزیرِاعظم پاکستان میاں محمد شہباز شریف کی ہدایات کی روشنی میں سرکاری دفاتر میں جدید نظام ''ای آفس'' کے نفاذ کا عمل تیزی سے جاری ہے۔ اسی سلسلے میں ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد میں ایک تربیتی سیشن کا انعقاد کیا گیا۔ یہ سیشن ادارہ کے کمیٹی روم میں منعقد ہوا جس میں چیف آئی ٹی بورڈ کے منیجر ایپلی مینیشن سید طاہر عباس نے ای آفس کے مؤثر استعمال سے متعلق تفصیلی راہنمائی فراہم کی۔ تربیت کا مقصد ادارہ جاتی عملے کو ای آفس کے جدید نظام سے روشناس کرانا اور سرکاری امور کی انجام دہی میں بہتری، شفافیت اور تیزی کو فروغ دینا تھا۔ ادارہ کے ڈائریکٹر جنرل، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے اس موقع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ای آفس کا نفاذ ایک مثبت اور دور رس قدم ہے جس سے ادارہ جاتی نظم و نسق میں نمایاں بہتری آئے گی۔ انھوں نے کہا کہ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال سرکاری اداروں کی کارکردگی کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ جملہ ملازمین کو چاہیے کہ وہ اس نظام کو سنجیدگی سے اپنائیں اور اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں اضافے کے لیے اس تربیت سے بھرپور استفادہ حاصل کریں۔

چینی تعلیمی وفد کا ادارۂ فروغِ قومی زبان کا دورہ، طلباء و طالبات کے باہمی تبادلے کے جامع پروگرام کا آغاز

اسلام آباد۔ چین کے ایک اعلیٰ سطح کے بین الاقوامی تعلیمی وفد نے ادارۂ فروغِ قومی زبان اسلام آباد کا دورہ کیا۔ یہ وفد پاکستان اور چین کے مابین طلباء و طالبات کے تبادلے کے ایک جامع پروگرام کے تحت پاکستان آیا تھا۔ اس پروگرام کے تحت دونوں ممالک کے ۱۰۰۰ طلباء و طالبات ایک دوسرے کی جامعات میں تعلیم حاصل کریں گے، جس سے نہ صرف تعلیمی روابط کو فروغ ملے گا بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور ثقافتی ہم آہنگی بھی مضبوط ہوگی۔ وفد کی قیادت ممتاز چینی ماہرِ تعلیم و سائنس دان، نارتھ ویسٹ اے اینڈ ایف یونیورسٹی کے پروفیسر چنگ شی شو نے کی جبکہ دیگر اراکین میں ماہر ادویات چاؤ لیانگ، ماہر ایگری کلچر چاؤ لی من اور کئی اہم شخصیات شامل تھیں۔ پاکستانی وفد کی نمائندگی ڈاکٹر مشتاق احمد اور محمد مرتضیٰ نور نے کی، ایگزیکٹو ڈائریکٹر ادارہ فروغِ قومی زبان ڈاکٹر راشد حمید اور دیگر افسران نے مہمانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور باہمی تعلیمی تعاون پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر ادارے کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے پاک چین دوستی کو تاریخی اور مثالی قرار دیتے ہوئے طلباء و طالبات کے تبادلے کے منصوبے کو دونوں ممالک کے درمیان اعتماد اور ترقی کا مظہر قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم، ثقافت اور زبان کے شعبوں میں اس طرح کے تعاون سے دونوں ملکوں کے نوجوانوں میں باہمی سمجھ بوجھ اور یکجہتی کو فروغ ملے گا۔ چنگ شی شو نے بھی پاکستان کے تعلیمی اداروں، طلباء و طالبات کی ذہانت اور پاکستانی قوم کی مہمان نوازی کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان اور چین کے تعلقات محض سرکاری سطح تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک عوامی اور ثقافتی دوستی میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ دونوں ممالک کے نوجوان ہی اس دوستی کے اصل سفیر ہیں۔ دونوں ممالک نے عزم کیا کہ وہ مستقبل میں بھی تعلیمی، ثقافتی اور سائنسی میدانوں میں تعاون جاری رکھیں گے تاکہ خطے میں امن، ترقی اور خوشحالی کو یقینی بنایا جا سکے۔

☆☆☆☆

چینی تعلیمی وفد کا ادارۂ فروغِ قومی زبان کے دورہ کے موقع پر ڈائریکٹر جنرل، پروفیسر محمد سلیم مظہر، ایگزیکٹو ڈائریکٹر ڈاکٹر راشد حمید، پروفیسر چنگ شی شو، ماہر ادویات چاؤ لیانگ، ماہر ایگری کلچر چاؤ لی من، ڈاکٹر مشتاق احمد، محمد مرتضیٰ نور، ڈپٹی ڈائریکٹر محبوب بگٹی و دیگر کا گروپ فوٹو

یکم مئی یومِ مزدور کے موقع پر پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ڈائریکٹر جنرل، ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد کا پیغام

یومِ مزدور ہمیں ان عظیم افراد کی قربانیوں کی یاد دلاتا ہے جنھوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی اور تاریخ میں ایک روشن باب رقم کیا۔ یہ دن نہ صرف مزدوروں کے حقوق کو تسلیم کرنے کا دن ہے، بلکہ اس بات کا اعادہ بھی ہے کہ معاشرے کی ترقی اور خوشحالی میں مزدور طبقہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد کی جانب سے ہم تمام مزدور بھائیوں اور بہنوں کو سلام پیش کرتے ہیں، جن کی شب و روز کی محنت سے ہمارا معاشرہ، معیشت اور قوم آگے بڑھتی ہے۔ آیئے، ہم سب مل کر مساوات، انصاف اور محنت کے احترام پر مبنی ایک مضبوط اور روشن پاکستان کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کریں۔